ISSN - 2582-4619 - VOL 63 - ISSUE 12 - 25 APRIL 2026
TAMEER-E-HAYAT

تعمیرِ حیات لکھنؤ

پندرہ روزہ

ارباب علم ودانش کی ذمہ داری

''تعلیم وتربیت کے ذمہ داروں کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ ہر ایسی چیز کا مقابلہ کریں جو مردانگی اور شجاعت کی روح کو کمزور کر رہی ہو اور عجز وتخنث پیدا کرتی ہو، عریاں صحافت نگاری، فحش اور ملحد ادب کی روک تھام کریں جو نوجوانوں میں نفاق، بے حیائی، فسق وفجور اور شہوت پرستی کی تبلیغ کر رہا ہو، ان پیشہ وروں کو رسول اللہ ﷺ کے فوجی کیمپ میں نہ داخل ہونے دیں جو نسل اسلامی کے قلب واخلاق میں فساد برپا کرنا چاہتے اور فسق ومعصیت اور فحش پسندی کو چند حقیر پیسوں کے لیے خوبصورت اور مزین بنا کر پیش کرتے ہیں۔''

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

(انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر)

سالانہ زرتعاون ₹500
۲۵/اپریل ۲۰۲۶ء
فی شمارہ -/25₹

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پندرہ روزہ تعمیرِ حیات لکھنؤ

ISSN 2582-4619

جلد نمبر ۶۳ | ۲۵ر اپریل ۲۰۲۶ء مطابق ۷ر ذیقعدہ ۱۴۴۷ھ | شمارہ نمبر ۱۲

اس شمارے میں

نعتِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم	سید محمد محسن کاکوروی مرحوم	۴
حج اور ابراہیم کی تلاش	محمد عمیر الصدیق دریابادی ندوی	۵
ایمان بالغیب	حضرت مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی	۷
زبان میں احتیاط ایمان کا تقاضا	مولانا عبدالرشید راجستھانی ندوی	۹
جنگ بدر حق و باطل کی پہلی فیصلہ کن جنگ	مولانا سید عنایت اللہ ندوی	۱۰
علامہ اقبالؒ - کلام اور پیام	مولانا نعیم الرحمٰن صدیقی ندوی	۱۳
علی گڑھ میں علامہ شبلیؒ کا علمی وفکری کردار	مولانا عبدالمتین ندوی	۱۵
بشر ہیں بے خبر ہیں---	مولانا عبدالرحیم ندوی	۱۸
غیرت وحمیت کا فقدان	مولانا محمد شعیب ندوی	۲۰
حقیقی خوشی کا راستہ	مولانا محمد سمعان خلیفہ ندوی	۲۲
مرد کی قوامیت کا مفہوم	مولانا منور سلطان ندوی	۲۳
حسد کے تباہ کن اثرات	مولانا محمد سلمان بجنوری ندوی	۲۶
حج بیت اللہ - عشق الٰہی کی معراج	محمد جاوید اختر ندوی	۲۸
اسرائیل کا قانون سزائے موت	محمد نفیس خان ندوی	۲۹
سوال وجواب	مفتی محمد ظفر عالم ندوی	۳۰

سرپرست

حضرت مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی

(ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

مدیر مسئول: شمس الحق ندوی

نائب مدیر: محمد عمیر الصدیق دریابادی ندوی

معاون مدیر

محمد اصطفاء الحسن کاندھلوی ندوی

محمد نفیس خان ندوی ❁ محمد جاوید اختر ندوی

مجلس مشاورت

مولانا عبدالعزیز بھٹکلی ندوی ❁ مولانا محمد خالد غازیپوری ندوی

قارئین محترم! تعمیرِ حیات کا سالانہ زرِ تعاون ذیل میں دیے گئے اکاؤنٹ میں جمع کرائیں!

TAMEER E HAYAT
A/c. No. 10863759868 (Current A/c.)
IFSC Code : SBIN0000125-- Swift Code : SBINNB157
State Bank of India, Main Branch, Lucknow

براہِ کرم رقم جمع ہوجانے کے بعد دفتر کے فون نمبر یا ای میل پر خریداری نمبر کے ساتھ اطلاع ضرور دیدیں۔

ترسیل زر اور خط وکتابت کا پتہ

TAMEER-E-HAYAT
Tagre Marg, Badshah Bagh, Lucknow - 226007, Call : 9559844716
website : http://tameerehayat.com - email : tameer1963@gmail.com

مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

سالانہ زرتعاون -/500	فی شمارہ -/25	ایشیائی، یورپی، افریقی وامریکی ممالک کے لئے	$100

ڈرافٹ منیجر تعمیر حیات کے نام سے بنائیں اور دفتر تعمیر حیات ندوۃ العلماء لکھنؤ کے پتہ پر روانہ کریں۔ چیک سے بھیجی جانے والی رقم صرف All CBS Payable Multicity Cheques روانہ فرمائیں، بصورت دیگر =/30₹ جوڑ کر چیک دیں۔ براہ کرم اس کا خیال رکھیں۔

آپ کی خریداری نمبر کے نیچے اگر سرخ لکیر ہے تو سمجھیں کہ آپ کا زرتعاون ختم ہوچکا ہے، لہٰذا جلد ہی زرتعاون ارسال کریں۔ اور منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیں، موبائل یا فون نمبر اور پتے کے ساتھ پن کوڈ بھی لکھیں۔ (منیجر تعمیر حیات)

پرنٹر پبلشر محمد طٰہٰ اطہر نے آزاد پرنٹنگ پریس، نظیر آباد، لکھنؤ سے طبع کرا کے دفتر تعمیر حیات مجلس صحافت ونشریات ٹیگور مارگ، بادشاہ باغ لکھنؤ سے شائع کیا۔

شعروادب

نعتِ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

سید محمد محسن کاکوروی مرحوم (۱۸۸۵ء-۲۴/اپریل ۱۹۰۵ء)

ہے بے رنگی کے آئینہ میں نقشہ شکل انساں کا
تعالیٰ شانہ یہ روپ ہے کس حُسن پنہاں کا

توارد شکلِ حوروں میں سہی مضمونِ قرآں کا
مگر اللہ رے مطلع ناظمِ قدرت کے دیواں کا

مؤرخ اگلے وقتوں کا ہے، عشق اس سے کوئی پوچھے
کہ حق کے بعد ازل میں نور تھا کس روئے تاباں کا

کہوں ایمان کی سو بار اٹھا لوں سر پہ قرآں کو
کوئی ثانی نہ یزداں کا، نہ اس محبوبِ یزداں کا

وہ ہم صورت ہے معنی پرور عالم کی رحمت کا
وہ ہم معنیٰ ہے صورت آفریں کے لطف و احساں کا

خمیدہ نخل اعجاز اس کے اثمارِ خوارق سے
رسیدہ میوہ اس کی تربیت سے زہد و عرفاں کا

بتوں کو مثل مردہ سنگ پیکر دستِ قدرت نے
بنایا اپنے ہاتھوں سے جو مرہم زخمِ ایماں کا

لقب امی و مثلِ لوحِ محفوظ اس کے سینے میں
بھرا علم اولین و آخریں، پیدا و پنہاں کا

حمایت اہل عالم کی، اشارہ عینِ رحمت کا
شفاعت عاصیوں کی اِک کرشمہ چشمِ احساں کا

اداریہ

حج اور براہیمؑ کی تلاش

محمد عمیر الصدیق دریابادی ندوی

اتفاق ہے کہ یہ سطریں اس وقت قلم وقرطاس کے حوالے ہورہی ہیں جو تاریخ کے حوالے سے ۲۱/اپریل کی شناخت رکھتا ہے یعنی وہ دن جب علامہ اقبال اس عالم فانی سے رخصت ہوئے۔ اس دنیا میں ان کے وجود کو اردو زبان کی خوش اقبالی سے تعبیر کیا گیا۔ کہا گیا کہ غالبؔ کے بعد شاید ہی کسی کو خیال آیا ہو کہ ہندوستان میں پھر کوئی ایسا شخص پیدا ہوگا جو اردو شاعری کے جسم میں ایک نئی روح پھونک دے گا؛ لیکن یہ تاثر محض ایک اچٹتی نظر کا ہے۔ اقبال تو ابتدا ہی میں خود سے آگاہ ہوگئے تھے اور یہ آگاہی بھی کیا تھی، سراپا سوز وساز آرزو رہنا، یا پھر زخمیٔ شمشیر ذوقِ جستجو رہنا۔

اسی سوز وگداز اور اسی ذوق جستجو نے اہل نظر کی نظر میں اقبال کی تصویر یہ پیش کی کہ ان کی زندگی کا ہر لمحہ ملت کی زندگی کے لیے وقف تھا، ملت کا ایسا غم خوار، ملت کے بڑے بڑے غم خواروں کی نظر میں کوئی اور نہیں ہوا۔

اقبال کی یادوں کو وقتاً فوقتاً دہراتے رہنے کی ضرورت ہے؛ لیکن یہاں یہ یاد اصلاً موسم حج کی مناسبت سے زبان پر آگئی۔

حج کے دن اب قریب سے قریب تر ہوتے جاتے ہیں۔ عازمینِ حج کی پروازوں کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے، یہ پروازیں اصلاً اس شوق اور اس آرزو کے پروں پر ہیں جس سے بڑھ کر ایک مومن کی کوئی آرزو ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ عشق، ایثار، قربانی اور ابتدائے عمر سے دل ودماغ اور فکر وجذبہ کی طہارت اور سلامتی کی وہ یادگار ہے جس کو یاد رکھنے کی بات خود کلام الٰہی کا حصہ بن گئی: "یاد کرو جب ہم نے ابراہیمؑ کو بیت اللہ کی جگہ بتادی"۔ اس ایک جملے نے حج کی پوری عبادت کو یادِ ابراہیم میں بدل دیا۔ حج اور عمرہ کے مناسک، ارکان اور واجبات ومستحبات دیکھا جائے تو یہ سب صرف ایک رشتہ میں پروئے گئے اور وہ رشتہ، رشتۂ ابراہیمی کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے؟

جس بچہ کو رشد اور سلامتِ طبع کی نعمت ایسے ماحول میں روز اول ہی سے حاصل ہوجائے جہاں صرف خارا تراشی ہی زندگی کا اول آخر پیشہ بن گیا ہو وہاں اسی ماحول کا پروردہ ایک کم عمر انسانی وجود سنگ تراشی کے فن کے بارے میں پوچھنے کے بجائے، پتھر تراشنے والوں کے ذہن اور دل سے پوچھنے لگتا ہے کہ اس فن کاری نے ذہنی غلامی کی اس نوبت پر کیوں پہنچادیا کہ اپنے ہی ہاتھوں تراشے پتھروں کو خدا بنا بیٹھے۔ یہ تو پتھر ہیں، ہر حس سے محروم، یہ دھڑک نہیں سکتے، بینائی سے محروم، سماعت سے محروم، ہر عمل اور حرکت سے محروم، ان کے لیے نفع نقصان بے معنی۔ ایک کم عمر وجود کے لبوں سے قوم کے جہاں دیدہ بڑوں کے کانوں میں 'اف لکم' صرف کلمہ افسوس وملامت ہی نہیں ان کی کند عقلوں پر ضرب کاری تھی۔ ابراہیمؑ کا بچپن، جوانی کی راتوں میں چاند تاروں سے ان کی گفتگو اور پھر ان سے بیزاری اور شباب کے دنوں میں آفتاب کی حدت وحرارت سے توحید کی کرنوں کا حصول، پھر خاندان اور وطن کے ترک وہجرت کے وہ فیصلے جو شاید اس دور میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایسی ندرت کے حامل کہ انسانی معاشروں کی تاریخ میں ان سے پہلے ان کے نقوش اور کہیں بھی نہیں، تاریخ پہلی بار "إني مهاجر الى ربي" کے نغمے کی سماعت سے آشنا ہوئی، بیوی اور بچے کو خشک اور بے جان زمین پر تنہا چھوڑنے کی ہمت، ابراہیمؑ سے پہلے ایسی اور مثال بھی کہاں۔ اور یہ مثال بھی کہاں جہاں اپنے رب کی خوشنودی کے لیے ایک خواب کو حقیقت کی تعبیر دینے کا حوصلہ، اپنے بیٹے کی گردن پر چھری رکھ کر سامنے آیا ہو۔

قرآن مجید نے جگہ جگہ ابراہیمی زندگی کے حوالے شاید اسی لیے دیے کہ انسانی زندگی کے ارتقاء میں توحید اور شرک اور خود ساختہ گھڑے ہوئے خداؤں کی کثرت اسی دور ابراہیم کی یادگار ہے۔ بیت اللہ کی تعمیر میں، انسان کے تراشیدہ خداؤں کی تخریب کا بھی اعلان تھا۔ 'مکان البیت' کے معاً بعد "أن لاتشرک بی شیئاً" کے الفاظ اسی معرکہ توحید وشرک کے بیان ہونے کا اعلان ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کی زندگی میں ایک طرف تو ان کے خالص مسلم ہونے کا اظہار ہے تو معاً بعد شرک سے برأت کا اعلان بھی ہے۔ اسلام کے اقرار کے ساتھ شرک کے انکار کا یہ انداز نرالا ہے۔ اس لیے حج کی عبادت اسی معرکہ کے خیر وشر ہونے کی حقیقتوں کو زندہ رکھنے کی علامت بن گئی۔ جو بتاتی ہے کہ اس کے لیے ہر دور میں اپنے براہیم کی تلاش کا عمل جاری رکھنے کی ذمہ داری ہے۔

اقبال اسی لیے یاد آگئے کہ ان کی شاعری نے اردو کی وسیع ترین دنیا میں پہلی بار اس حقیقت کو یاد دلایا کہ:

یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے صنم کدہ ہے جہاں لا الٰہ الا اللہ

میر وغالب اور امیر وداغ کی نہایت روشن کائنات شعری میں اقبال کی انفرادیت کی وجہیں اور بھی ہیں؛ لیکن انہوں نے جس طرح کارِ خلیلاں کے استعارہ سے کام لیا، وہ بار بار پڑھنے اور اس سے زیادہ غور کرنے کی ضرورت کا احساس دلاتا ہے۔ یہ آواز، بشارت کا سبب بن جاتی ہے کہ:

توڑ دیتا ہے بت ہستی کو ابراہیمِ عشق

کیسی کیسی تعبیریں ہیں:

ذوق حاضر ہے تو پھر لازم ہے ایمانِ خلیل ورنہ خاکستر ہے تیری زندگی کا پیرہن
آگ ہے، اولادِ ابراہیم ہے، نمرود ہے کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے

حج جانے والوں کی تربیت گاہوں میں ارکان وواجبات کے ظاہری علم کی اہمیت اپنی جگہ؛ لیکن اس کی روح سے آشنائی اس لیے مطلوب ہے کہ اب سارا جہاں ایک صنم کدہ بنتا جاتا ہے۔ صنم صرف پتھروں کے ہوتے تو شاید ایک ضرب کاری کافی ہوتی یہاں تو خاندان، رشتوں، حکومت، وطن، علاقہ، طاقت، دولت کے وہ سارے صنم موجود ہیں جن سے اللہ کے خلیل کا سابقہ ہوا تھا۔ اس وقت بھی نمرود کی دانش حاضر ایک فتنہ تھی۔ اقبال نے جب لا الٰہ الا اللہ کا نغمہ سنایا تو یہ شعوری کوشش تھی کہ:

عذابِ دانشِ حاضر سے باخبر ہوں میں کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیل

یہ حقیقت عیاں تھی کہ:

صنم کدہ ہے جہاں اور مرد حق ہے خلیل یہ نکتہ وہ ہے کہ پوشیدہ لاالٰہ میں ہے

حج کے موسم عشق میں اقبال کے یوم وصال کی یاد سے اگر حج کی عبادت کی روح، امت ابراہیم کے جسم کو ایک بار پھر بے قرار کردے تو اقبال کے اس قول کی معنویت، الہامی کیفیت کا لطف عطا کرنے لگتی ہے کہ:

یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے

حج یقیناً اللہ کے لیے ہے؛ لیکن اللہ کے دوست کا وہ یقین بھی سامنے رہے جس کے لیے اقبال نے کہا کہ:

یقیں مثلِ خلیل آتش نشینی

زندگی کی ہر گزرگاہ سے ہو کر مرکز توحید پر جمع ہونے اور اس کو شرک وکفر کی ہر نجاست سے پاک صاف رکھنے کا اعلان کا حق زبان ابراہیم کو عطا کیا گیا تو وجہ صاف ہے کہ حج مقام عشق ویقیں ہے۔ اس کو سمجھنا ہے تو حضرت ابراہیمؑ کو تلاش کرنا ہوگا۔ ☆☆☆

معروف عالمِ دین مولانا محمد عبداللہ مغیثی نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا

ملک کے نامور عالمِ دین، مختلف ملی تنظیموں اور اداروں سے وابستہ، اور ندوۃ العلماء کی مجلس شوریٰ کے رکن محترم جناب مولانا محمد عبداللہ مغیثی صاحب ۴/اپریل ۲۰۲۶ء کو ہم سے رخصت ہوگئے، انا للہ و انا الیہ راجعون۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے ایک باعمل عالمِ دین اور فعال ومتحرک ملی رہنما کی حیثیت سے زندگی گذاری۔ ان کو یہ خصوصیت بھی حاصل رہی کہ وہ ملک کے تین عظیم ملی اداروں ندوۃ العلماء، مظاہر علوم سہارنپور اور دارالعلوم دیوبند وقف کی مجلسِ شوریٰ کے رکن رہے۔ اس کے علاوہ وہ رکن مجلس عاملہ جمعیت علماء ہند، صدر آل انڈیا ملی کونسل اور رکن رابطہ ادب اسلامی بھی رہے۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے ۲/فروری ۱۹۳۶ء کو موضع گھگروالی ضلع سہارنپور میں منشی مغیث الدین مرحوم کے گھر میں آنکھیں کھولیں۔ ابتدائی تعلیم کے بعد دارالعلوم دیوبند سے تکمیل ۱۹۵۷ء میں فارغ التحصیل ہوئے، وہیں سے تکمیل فی التفسیر کی سند بھی حاصل کی۔ ۱۹۶۰ء جامعہ گلزار حسینیہ، اجراڑہ، میرٹھ میں بحیثیت مدرس تقرر ہوا، دوسال بعد وہاں کے مہتمم قرار پائے، اور جہاں جامعہ کے تعلیمی معیار کو بلند کیا، وہیں اس کے رقبہ میں کافی توسیع اور اضافہ کیا، اور واقعۃً اس کو ایک جامعہ کی شکل دی۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے احسان وتزکیہ کے میدان میں حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری سے استفادہ کیا، اور مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہا اللہ سے اجازت حاصل کی۔ مفکرِ اسلامؒ سے ان کو گہرا تعلق تھا، اور حضرت بھی ان پر اعتماد کرتے تھے، اور بعض پروگراموں میں ان کو اپنی نیابت کا شرف بھی بخشا۔ مولانا کا انتقال امت مسلمہ ہندیہ کے لیے بڑا علمی وروحانی خسارہ ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے اعمال وخدمات کو قبولیت سے نوازے، درجات بلند فرمائے، متعلقین ولواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے، اور ان کا نعم البدل عطا فرمائے، آمین۔ ☆☆

تعلیم القرآن

ایمان بالغیب

حضرت مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی (ناظم ندوۃ العلماء)

{الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ}
(جو غیب کو مانتے ہیں)

{هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ} کے بعد اہل ایمان کی چھ بنیادی صفات کا ذکر ہے اور یہ باتیں حقیقت میں وہ بنیادیں ہیں جن کو اختیار کر کے آدمی تقویٰ والی زندگی حاصل کرسکتا ہے۔

سب سے پہلے ایمان بالغیب کا تذکرہ ہے، ظاہر ہے بغیر دیکھے بات ماننا ایک مشکل کام ہے، دیکھ کر تو سب لوگ مان لیتے ہیں، لیکن بن دیکھے ماننا اصل بات ہے۔ اللہ پر یقین، قیامت پر یقین، حشر ونشر پر یقین اور ملائکہ پر یقین؛ یہ وہ چیزیں ہیں جن کو ہم نے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا ہے، لیکن ہمارے نبی حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے ان چیزوں کا ذکر فرمایا ہے، اس لیے ہمیں ہر حال میں ان کو ماننا ہے اور یہی ہمارا اصل امتحان ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس دنیا کا نظام ایسا رکھا ہے کہ یہاں کوئی ایسا عمل سامنے نہیں آتا جس کے نتیجے میں بات کھل جائے، ایسا نہیں ہوتا کہ ایک طرف مسلمان ہیں اور دوسری طرف اہل شرک و کفر ونفاق ہیں، اگر ان کے درمیان مقابلہ ہو رہا ہے تو عام طور پر یہ نہیں ہوتا کہ وہ کچھ نہ کریں اور آگے بڑھتے چلے جائیں اور ملک کے ملک فتح ہوتے چلے جائیں۔ یہاں تک کہ اللہ کے نبی ﷺ کے زمانہ میں بھی یہ نظام نہیں تھا۔ ابوسفیان سے جب ہرقل نے یہ سوال کیا کہ کیا کبھی تمہارا ان سے مقابلہ ہوا ہے؟ تو انھوں نے کہا: ہاں، مقابلہ ہوا ہے لیکن کبھی ہمیں ان پر فتح ملتی ہے اور کبھی انھیں ہم پر، بخاری کی روایت میں یہ الفاظ ہیں:

"الْحَرْبُ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُ سِجَالٌ۔" (ہمارے اور ان کے درمیان جنگ برابر سرابر رہتی ہے۔)
(صحيح البخاري، كتاب بدء الوحي: ۷).

گویا انھوں نے ایک حقیقت بیان کی تھی، اس لیے کہ ان کے سامنے کبھی ایسا منظر پیش نہیں آیا کہ اہل ایمان کو ایک کانٹا بھی نہ چبھا ہو اور فتح حاصل ہوگئی ہو بلکہ انھوں نے تو یہاں تک دیکھا کہ میدان جنگ میں اللہ کے نبی ﷺ کو تکلیف پہنچی اور غزوۂ احد کے موقع پر آپ ﷺ کے دندان مبارک شہید ہوئے، آپ کے رخسار مبارک پر خون جاری ہوگیا اور نہ جانے آپ ﷺ کو کیسی کیسی تکلیفیں دی گئیں لیکن آپ ﷺ نے ان سب مصائب کو برداشت کیا۔

یہ سارے حقائق ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ دنیا میں اللہ کا نظام یہی ہے اور غیب پر ایمان لانا ضروری ہے، اگر بات کھل جاتی تو کوئی مشکل ہی باقی نہ رہتی، جیسا کہ مشرکین مکہ ایمان لانے کے لیے اللہ کے نبی ﷺ سے بے جا مطالبات کرتے تھے اور کہتے تھے کہ:

{لَن نُّؤْمِنَ لَكَ حَتَّى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْأَرْضِ يَنبُوعًا ★ أَوْ تَكُونَ لَكَ جَنَّةٌ مِّن نَّخِيلٍ وَعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْأَنْهَارَ خِلَالَهَا تَفْجِيرًا ★ أَوْ تُسْقِطَ السَّمَاءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا أَوْ تَأْتِيَ بِاللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ قَبِيلًا ★ أَوْ يَكُونَ لَكَ بَيْتٌ مِّن زُخْرُفٍ أَوْ تَرْقَىٰ فِي السَّمَاءِ}
(الإسراء: ۹۳-۹۰)

(ہم تو اس وقت تک آپ کو ماننے والے نہیں جب تک آپ ہمارے لیے زمین سے کوئی چشمہ نہ جاری کردیں، یا آپ کے لیے کھجور اور انگور کا باغ ہو پھر آپ اس کے بیچ سے نہریں نکال دیں، یا جیسا کہ آپ کا خیال ہے آپ ہم پر آسمان کے ٹکڑے گرادیں یا اللہ کو اور فرشتوں کو نگاہوں کے سامنے لے آئیں یا سونے کا آپ کا کوئی گھر ہو یا آپ آسمان پر چڑھ جائیں۔)

قرآن مجید ایسے لوگوں کو جواب دیتے ہوئے کہتا ہے کہ اگر ان کے لیے ہم یہ سب کچھ کردیں تب بھی یہ لوگ ایمان لانے والے نہیں ہیں بلکہ اس پر ان کا ردعمل یہ ہوگا کہ یہ لوگ کہیں گے:

{لَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ} (الأنعام: ۷) (یقیناً انکار کرنے والے یہی کہیں گے کہ کچھ نہیں یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔)

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اگر سب کچھ کھول دیا جائے تو وہ غیب نہیں رہ جائے گا اور اس دنیا میں بندوں کا امتحان بھی نہیں ہوسکے گا، جب کہ یہ دنیا دارالامتحان ہے، یہاں یہ بات طے نہیں کہ اگر کوئی ایمان لے آیا تو اس کے لیے دنیا کو جنت نشاں بنا دیا جائے گا بلکہ اس دنیا میں اہل ایمان کے لیے یہ اعلان ہے:

"حُفَّتِ الْجَنَّةُ بِالْمَكَارِهِ وَحُفَّتِ النَّارُ بِالشَّهَوَاتِ۔" (صحيح مسلم، كتاب الجنة وصفة نعيمها وأهلها: ۷۳۰۸)

(جنت کو سختیوں سے اور جہنم کو خواہشات سے گھیر دیا گیا ہے۔)

اس دنیا میں اگر کوئی صاحب ایمان تنگی و مصیبت میں مبتلا ہے تو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے، ایسا نہیں کہ ایمان والوں پر دنیا میں پریشانی نہیں آسکتی، اللہ چاہتا ہے کہ ایمان والوں کا دنیا میں امتحان ہو، تاکہ آخرت میں ان کے درجات اونچے ہوجائیں۔ یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ جو لوگ اللہ پر سچا یقین اور ایمان رکھتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کے دل میں سکون کی ایسی لذت عطا فرماتے ہیں جس کی بنیاد پر انھیں اس دنیا ہی میں جنت کے مزے آنے لگتے ہیں، لیکن دنیا کی یہ بہاریں، یہاں کی زیب وزینت اور آرائشیں اور یہاں کی طاقتیں و حکومتیں، اللہ تبارک وتعالیٰ نے اصلاً ایمان والوں کے لیے نہیں رکھی ہیں۔

قرآن وحدیث میں ہمیں اللہ کی صفات کے بارے میں، فرشتوں اور جنت ودوزخ اور آخرت کے بارے میں بتایا گیا اور صادق ومصدوق کے ذریعہ بتایا گیا، جب ہم نے ان کو مان لیا تو وہ جو کہیں گے اس کو بھی ہم مانیں گے۔

آپ ﷺ جب معراج کے لیے تشریف لے گئے اور صبح کو آپ ﷺ نے لوگوں کے درمیان قصہ بیان کیا تو کچھ مشرکین حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے، ان کو یہ گمان تھا کہ آج صدیق اکبر کا یقین متزلزل ہوسکتا ہے، انھوں نے جاکر صدیق اکبرؓ سے معلوم کیا کہ اگر کوئی آدمی تم سے یہ کہے کہ میں آج رات آسمان پر گیا تھا، میں نے وہاں جنت کی سیر کی اور بہت سے مناظر بھی دیکھے تو کیا تم اس بات کو سچ مانو گے؟ انھوں نے فرمایا: ایسا نہیں ہوسکتا، پھر وہ لوگ بولے کہ محمد (ﷺ) جن کا تم دم بھرتے ہو، ان کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ آج رات آسمان تک گئے تھے، یہ سن کر حضرت صدیق اکبرؓ نے فرمایا کہ:

"لَئِنْ كَانَ قَالَ ذٰلِكَ لَقَدْ صَدَقَ۔"

(اگر (آپ ﷺ) نے ایسا کہا ہے تو سو فیصد سچ کہا ہے۔)

اس کے بعد حضرت صدیق اکبرؓ نے یہ بات فرمائی کہ:

"إِنِّيْ لَأُصَدِّقُهُ فِيْمَا هُوَ أَبْعَدُ مِنْ ذٰلِكَ أُصَدِّقُهُ بِخَبَرِ السَّمَاءِ فِيْ غَدْوَةٍ أَوْ رَوْحَةٍ۔"

(میں تو ان کی جس بات پر مہر تصدیق ثبت کرتا ہوں وہ اس سے بھی بڑی ہے، میں ان کی تصدیق کرتا ہوں کہ ان کو آسمان کی خبر صبح وشام پہنچتی رہتی ہے۔)

(المستدرک للحاکم، کتاب معرفة الصحابة، فی ذکر أبی بکر: ۴۴۰۷)

ظاہر ہے یہی ایمان بالغیب ہے جس کا قرآن مجید میں بھی ذکر ہے:

{وَالَّذِيْ جَاءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖ أُولٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ} (الزمر: ۳۳)

(اور جو سچائی لے کر آیا اور جس نے اس کو سچ مانا وہی لوگ متقی ہیں۔)

فاران کی چوٹیوں پر کھڑے ہوکر آپ ﷺ نے جب یہ اعلان فرمایا کہ اے لوگو! اگر میں تم سے کہوں کہ پہاڑ کی اس جانب سے ایک لشکر تم پر حملہ آور ہونا چاہتا ہے تو کیا تم اس کو سچ مانو گے؟ لوگوں نے کہا: اگر آپ یہ بات کہتے ہیں تو ہم سچ مانیں گے، آپ ﷺ نے ایک چھپی ہوئی چیز کے بارے میں اس لیے ان سے سوال کیا کہ آپ ﷺ کی صداقت وامانت ان کے سامنے تھی، جب وہ ایک مرتبہ اقرار کرلیں گے تو شاید آگے بھی بات کو ماننا آسان ہو، لیکن مزاجوں میں عناد تھا، اسی لیے آپ ﷺ نے جب ایمان بالغیب کی دعوت دی اور فرمایا:

"فَإِنِّيْ نَذِيْرٌ لَكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ۔" (بلاشبہ میں تمہیں ایک سخت عذاب کے آنے سے پہلے ڈرانے والا ہوں۔)

یہ بات سن کر وہ لوگ اکھڑ گئے، یہاں تک ابولہب نے یہ بات کہی کہ:

"تَبًّا لَكَ سَائِرَ الْيَوْمِ، أَلِهٰذَا جَمَعْتَنَا"

(تیرا سارا دن برباد ہو، کیا اسی لیے تم نے ہمیں جمع کیا تھا؟!)

(صحیح البخاری، کتاب التفسیر، باب وأنذر عشیرتک الأقربین: ۴۷۷۰)

حاصل یہ کہ ایمان بالغیب اصل چیز ہے اور امتحان کا آغاز بھی یہیں سے ہوتا ہے، اگر کوئی دیکھ کر مان رہا ہے تو اس کی وہ حقیقت نہیں ہوسکتی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمیں جو زندگی عطا فرمائی ہے، ہمیں اس میں لحہ لحہ امتحان دینا ہے، کوئی یہ نہ سمجھے کہ ہم ایک مرتبہ مسلمان ہوگئے اور اب سجا سجایا دسترخوان ہمیں مل جائے گا، حکومتیں ہمارے ہاتھ میں ہوں گی اور ہمارے مزے ہی مزے ہوں گے۔ قرآن مجید میں صاف طور پر یہ وضاحت موجود ہے کہ:

{أَحَسِبَ النَّاسُ أَنْ يُّتْرَكُوْا أَنْ يَّقُوْلُوْا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ★ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكَاذِبِيْنَ} (العنکبوت: ۳-۲) (کیا لوگوں نے یہ سمجھا ہے کہ وہ اتنا کہہ کر چھوٹ جائیں گے کہ ہم ایمان لائے ہیں اور ان کو آزمایا نہیں جائے گا اور ہم ان سے پہلے والوں کو بھی آزما چکے ہیں تو اللہ پوری طرح جان کر رہے گا کہ ان میں کون لوگ سچے ہیں اور وہ یقیناً جھوٹوں کو بھی جان کر رہے گا۔)

☆☆☆

تعلیم الحدیث

زبان میں احتیاط ایمان کا تقاضا

مولانا عبدالرشید راجستھانی ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا أَنَّ رَجُلاً قَالَ لِلنَّبِيِّ ﷺ: مَا شَاءَ اللهُ وَشِئْتَ، فَقَالَ: "أَجَعَلْتَنِي لِلهِ نِدًّا؟! بَلْ مَا شَاءَ اللهُ وَحْدَهُ۔ (مسند أحمد: ۱۸۳۹)

ترجمہ: عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے کہا: جو اللہ چاہے اور آپ چاہیں، تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا تم نے مجھے اللہ کا شریک بنا دیا؟! بلکہ یوں کہو: جو اللہ اکیلا چاہے۔''

تشریح: اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے نہایت بلیغ اور جلالی اسلوب میں توحید کی حساسیت کی جانب متوجہ فرمایا۔ ایک ایسا جملہ جو بظاہر معمولی معلوم ہوتا ہے، اس پر آپ ﷺ نے فوراً نکیر فرمائی، کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ساتھ غیر کی مشیت کو اس انداز سے جمع کیا گیا تھا جس سے برابری کا وہم پیدا ہو سکتا تھا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ توحید محض قلبی عقیدہ کا نام نہیں بلکہ زبان کے الفاظ اور تعبیرات بھی اسی کے تابع ہونا چاہیے۔

آپ ﷺ نے صرف غلطی کی تردید نہیں فرمائی بلکہ صحیح اسلوب بھی سکھایا۔ چنانچہ "ماشاء اللہ وحدہ" کہنے کی تلقین فرمائی، اور دیگر روایات میں یہ رہنمائی بھی دی کہ اگر کسی دوسرے کا ذکر مقصود ہو تو "ثم" کے ساتھ کہا جائے: "ما شاء الله ثم شئت"۔ جو اللہ تعالیٰ چاہے، پھر اس کے بعد آپ چاہیں، اس میں ترتیب اور تابعیت کا مفہوم پایا جاتا ہے، جو توحید کے تقاضے کے عین مطابق ہے، بخلاف ''و'' کے جس میں جمع اور مساوات کا احتمال ہوتا ہے۔

اسی مفہوم کو حضرت قتیلہ بنت صیفی رضی اللہ عنہا کی روایت مزید وضاحت کے ساتھ بیان کرتی ہے جس میں آیا ہے کہ ایک یہودی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا: تم لوگ شرک کرتے ہو، تم کہتے ہو: ''جو اللہ چاہے اور تم چاہو'' اور تم کہتے ہو: ''کعبہ کی قسم''۔ اس پر نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرام سے ارشاد فرمایا کہ جب قسم کھاؤ تو یوں کہو: ''ربِ کعبہ کی قسم''، اور یہ کہو: ''جو اللہ چاہے پھر تم چاہو''۔

(مسند احمد: ۲۷۰۹۳)

یہ تعلیم محض ایک لفظی اصلاح نہیں بلکہ توحید کے باب میں ایک اصولی رہنمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات، صفات اور اختیارات میں کسی قسم کی شرکت کا شائبہ بھی باقی نہ رہے۔ اسی باب میں متعدد احادیث وارد ہوئی ہیں جو زبان کی اصلاح کے ذریعے عقیدہ کی حفاظت کا اہتمام کرتی ہیں۔

چنانچہ نبی کریم ﷺ نے اس سے بھی منع فرمایا کہ کوئی شخص اپنے غلام یا خادم کے لیے ''عبدي'' (میرا بندہ) اور ''أمتي'' (میری بندی) کے الفاظ استعمال کرے، بلکہ فرمایا کہ ''فتاي'' (میرا نوجوان) اور ''فتاتي'' کہے، اور غلام اپنے آقا کو ''ربي'' (میرا رب) نہ کہے بلکہ ''سيدي'' (میرے سردار) کہے۔ (بخاري: ۲۵۵۲)

اس ہدایت میں بھی یہی حکمت کارفرما ہے کہ ربوبیت کا لفظ اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص رہے اور انسانی تعلقات میں ایسا لفظ نہ آئے جو کسی قسم کا اشتباہ پیدا کرے۔

اسی طرح آپ ﷺ نے اس بات کو بھی ناپسند فرمایا کہ کوئی کہے: "مطرنا بنوء كذا" (ہمیں فلاں ستارے کی وجہ سے بارش ملی)، اور اس کی اصلاح کرتے ہوئے یہ تعلیم دی کہ بارش کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا جائے۔ (بخاري: ۸۴۶)

ان تمام نصوص کا خلاصہ یہ ہے کہ شریعت نے توحید کی حفاظت کے لیے صرف بڑے بڑے شرکیہ عقائد ہی کی تردید نہیں کی بلکہ ان باریک اور دقیق پہلوؤں کی بھی اصلاح فرمائی ہے جو بظاہر معمولی محسوس ہوتے ہیں مگر ان میں اعتقادی خلل کا اندیشہ ہوتا ہے۔ انسان کی زبان بسا اوقات غفلت میں ایسے کلمات ادا کر دیتی ہے جو اس کے ایمان کے منافی ہوتے ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ مومن اپنے الفاظ کا بھی محاسبہ کرے اور انہیں کتاب وسنت کے تابع بنائے۔

فائدہ: رسول اللہ ﷺ کی یہ تعلیمات درحقیقت امت کے لیے رحمت اور خیرخواہی کا مظہر ہیں۔ آپ ﷺ نے ہمیں سکھایا کہ ایمان کی حفاظت صرف بڑے اعمال سے نہیں بلکہ چھوٹے چھوٹے الفاظ کی اصلاح سے بھی ہوتی ہے۔ جب زبان درست ہو جاتی ہے تو دل بھی سنور جاتا ہے، اور جب دل سنور جائے تو انسان کی پوری زندگی توحید کے نور سے منور ہو جاتی ہے۔

☆☆☆

تاریخ اسلام

جنگِ بدر حق و باطل کی پہلی فیصلہ کن جنگ

مولانا سید عنایت اللہ ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

۱۷/رمضان المبارک کا دن اسلامی تاریخ کا ایک ایسا یادگار دن ہے جس میں دنیا نے ایک عجیب وغریب منظر دیکھا، صرف ۳۱۳/پیدل، ایمان والے ایک ہزار ہتھیار بند، گھڑسوار بے ایمانوں پر غالب آگئے، اور غلبہ بھی ایسا واضح اور زبردست تھا کہ جس سے کفر کی زمین پر زلزلہ آگیا۔

اس عظیم الشان فتح وکامرانی کی خوشخبری اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو پہلے سے دیدی تھی، سورۂ انفال آیت ۷ میں ہے: " وَإِذ يَعِدُكُمُ اللهُ إِحدَى الطَّائِفَتَينِ أَنَّهَا لَكُم وَتَوَدُّونَ أَنَّ غَيرَ ذَاتِ الشَّوكَةِ تَكُونُ لَكُم وَيُرِيدُ اللهُ أَن يُحِقَّ الحَقَّ بِكَلِمٰتِهِ وَيَقطَعَ دَابِرَ الكٰفِرِينَ"۔ (یاد کریں اس وقت کو جب کہ اللہ تعالیٰ تم سے یہ وعدہ کررہا تھا کہ دو جماعتوں میں سے ایک پر تم کو کامیابی حاصل ہوگی، تم لوگ یہ چاہ رہے تھے کہ غیر مسلح جماعت تم کو مل جائے جبکہ اللہ یہ چاہتا تھا کہ اپنے معجزہ کے ذریعہ حق کو ثابت کردے اور کافروں کی جڑ کاٹ کر رکھ دے)۔

اس آیت سے صاف ظاہر ہورہا ہے کہ جنگ بدر سے پہلے اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی اللہ کے رسولؐ کو یہ اطلاع دے دی کہ مدینہ کی طرف دو جماعتیں آرہی ہیں، ایک جماعت مکہ سے آرہی ہے جو مدینہ پر حملہ کرکے یہاں قتل وغارت گری مچانا چاہتی ہے۔ دوسری جماعت شام سے آرہی ہے، مکہ کی طرف جانے والی ہے، اللہ تعالیٰ نے یہ خوشخبری بھی سنا دی کہ اللہ تعالیٰ ان دونوں جماعتوں میں سے ایک پر تم کو غلبہ عطا فرمائے گا۔

یہ اطلاع پانے کے بعد اللہ کے رسولؐ نے صحابہؓ سے مشورہ کرنا ضروری سمجھا کیونکہ اس سے پہلے مکہ والوں سے مسلمانوں کی کوئی جنگ باقاعدہ ہوئی نہیں تھی، یہ پہلی جنگ ہونے والی تھی، چنانچہ آپؐ نے مہاجرین وانصار سب کو جمع کیا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملنے والی اطلاع کا تذکرہ فرمایا اور ان سے اس سلسلہ میں مشورہ طلب کیا، مہاجرین میں سے حضرات نے باری باری کر کے آپؐ کے حکم کے آگے سر تسلیم خم کرنے کا اظہار کیا اور یہ کہا کہ آپؐ کا جو بھی حکم ہوگا اس کو ماننے کے لیے ہم ہر وقت تیار ہیں؛ لیکن اللہ کے رسولؐ ان کے جواب سے مطمئن نہیں ہوئے، آپؐ کو انصار کے جواب کا انتظار تھا، چنانچہ انصار میں سے قبیلہ خزرج کے سردار حضرت سعد بن عبادہ کھڑے ہوئے اور انہوں نے فرمایا کہ: اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہم کو سمندر میں بھی داخل ہونے کے لیے فرمائیں گے تو ہم سمندر میں بھی داخل ہوجائیں گے، ہم میں سے کوئی بھی پیچھے نہیں رہے گا۔

حضرت سعد کی بات سن کر اللہ کے رسولؐ بے انتہا خوش ہوئے اور صحابہ کو فوراً نکل کھڑے ہونے کا حکم دیا، چنانچہ اسی وقت ۳۱۳/صحابہ نکل کھڑے ہوئے، ان کے ساتھ صرف ۲/گھوڑے، ۷۰/اونٹ اور ٹوٹی پھوٹی تلواریں تھیں، اللہ کے رسولؐ ان صحابہ کو لے کر سیدھے مکہ کی جانب چل پڑے کیونکہ آپ کو یہ معلوم ہوچکا تھا کہ مکہ سے ایک بھاری بھرکم فوج مدینہ پر چڑھائی کرنے کے لیے نکل چکی ہے، مدینہ سے سو کلومیٹر چلنے کے بعد یہ اطلاع ملی کہ مکہ کی فوج پیش قدمی کرتے ہوئے تقریباً چار سو کلومیٹر کا فاصلہ طے کر چکی ہے، چنانچہ اللہ کے رسولؐ نے مزید آگے بڑھنے کے بجائے مدینہ سے ایک سو تیس کلومیٹر پر واقع بدر نامی ایک کنویں کے پاس پڑاؤ ڈال دینا مناسب سمجھا۔

بہت جلد ہی مکہ کی فوج آتی ہوئی دکھائی دی، دور سے مسلمانوں کو مکہ کی فوج بہت کم دکھائی دی اور مکہ والوں کو بھی مسلمانوں کی تعداد بہت کم دکھائی دی، اس منظر کو اللہ تعالیٰ نے سورۂ انفال آیت ۴۴ میں اس طرح بیان فرمایا: وَإِذ يُرِيكُمُوهُم إِذِ التَقَيتُم فِي أَعيُنِكُم قَلِيلاً وَيُقَلِّلُكُم فِي أَعيُنِهِم لِيَقضِيَ اللهُ أَمراً كَانَ مَفعُولاً۔ (یاد کرو اس وقت کو جب کہ اللہ تعالیٰ تم کو تمہاری آنکھوں میں ان کی تعداد کم دکھا رہا تھا اور ان کو ان کی نگاہوں میں تمہاری تعداد کم دکھا رہا تھا، جب تمہاری باہم مڈبھیڑ ہوئی تھی تاکہ اللہ تعالیٰ اس کام کو پورا کردے جس کو کیا جانا تھا)۔

یعنی جب وہ فوج تھوڑی دور پر تھی، تو ہر ایک کو اپنے مدمقابل کی تعداد کم دکھائی دی، ایسا اللہ تعالیٰ نے کروایا تھا تاکہ کوئی جنگ سے کترا کر بھاگ نہ جائے، کیونکہ اگر مکہ والوں کو مسلمانوں کی تعداد زیادہ دکھائی دیتی تو وہ مقابلہ میں آنے کے بجائے راہ فرار اختیار کرتے، اسی طرح اگر مسلمانوں کو مکہ والوں کی تعداد زیادہ دکھائی دیتی تو ان کا حوصلہ پست ہوجاتا اور کچھ لوگ بھاگنے کی کوشش کرتے اور جنگ کی نوبت شاید نہ آتی، اور اللہ تعالیٰ یہ چاہتا تھا کہ جنگ ہو اور اس جنگ میں مسلمانوں کی زبردست کامیابی کا ایک معجزانہ منظر دنیا کے سامنے آئے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے دونوں فریق کو ایسا منظر دکھایا کہ دونوں کا حوصلہ بلند رہے اور کوئی میدان سے بھاگنے کی کوشش نہ کرے، ۱۶/رمضان کو شام کے وقت مکہ کی فوج بدر کے مقام پر پہنچ گئی، جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کے ساتھ پہلے ہی پہنچ چکے تھے، اور میدان بدر میں اس حصہ میں مسلمانوں

نے اپنا پڑاؤ ڈال دیا تھا جو مدینہ سے قریب تھا اور جو نسبتاً اونچائی پر تھا، مشرکین بعد میں آئے تو انہوں نے اس کنارہ پر اپنا پڑاؤ ڈالا جو مدینہ سے دوری پر تھا اور نسبتاً نشیبی پر تھا، اس کی تعبیر سورہ انفال آیت ۴۲ میں اس طرح کی گئی ہے: "إِذْ أَنتُم بِالعُدوَةِ الدُّنيَا وَهُم بِالعُدوَةِ القُصوَىٰ" (یاد کرو اس وقت کو جب تم لوگ میدان کے قریب والے کنارہ پر تھے اور وہ دور والے کنارہ پر) کہنے کا مقصد یہ ہے کہ تمہارا پڑاؤ جنگی لحاظ سے بہتر پوزیشن پر تھا کیونکہ یہ کنارہ اونچائی اور بلندی پر تھا، رات ہی کو تیز موسلا دھار بارش ہوگئی، اوپر سے پانی بہہ کر نچلے حصے میں جا کر کھڑا ہو گیا، جس سے کافروں کو سخت زحمت اور مشقت کا سامنا کرنا پڑا، رات کے وقت اللہ کے رسولؐ چند صحابہ کو لے کر میدان کی طرف گئے اور انہیں بتایا کہ کفار کے بڑے بڑے سرغنے اس میدان میں مارے جائیں گے ابوجہل، عتبہ، شیبہ، امیہ بن خلف، ولید بن عتبہ وغیرہ مکہ کے دس سرداروں کے مارے جانے کی جگہ کی بھی تعیین فرمادی۔

رات ہی کے وقت اللہ کے رسول نہیں سوئے بلکہ نماز پڑھی اور انتہائی الحاح وزاری کے ساتھ دعاؤں میں مشغول ہو گئے پہلے بیٹھ کر دعا مانگی، پھر سجدہ میں چلے گئے، پھر کھڑے ہو کر دونوں ہاتھوں کو پھیلا کر زور زور سے دعا اس طرح مانگتے رہے کہ چادر سر سے نیچے گر گئی صبح صادق کے وقت اللہ تعالیٰ نے حضرت جبریل علیہ السلام کو یہ پیغام دے کر بھیجا کہ آپؐ پریشان نہ ہوں ہم ایک ہزار فرشتوں کو مسلمانوں کی مدد کے لیے بھیج رہے ہیں یہ سن کر آپؐ کو قلبی اطمینان حاصل ہوا، آپؐ نے مسکراتے ہوئے صحابہ کو یہ خوشخبری سنائی۔

آپؐ دعا میں جن الفاظ کو بار بار زور سے دہراتے تھے وہ یہ تھے: "اللهم أنجز لي ما وعدتني اللهم آت ما وعدتني اللهم إن تهلك هذه العصابة لا تُعبَد في الأرض" (اے اللہ جو وعدہ تو نے مجھ سے کیا ہے اسے پورا فرما، اے اللہ وہ عطا فرما جس کا وعدہ تو نے مجھ سے کیا ہے، اے اللہ اگر مسلمانوں کی یہ جماعت ہلاک ہوگئی تو زمین پر تیری عبادت نہیں کی جائے گی)۔

سورہ انفال آیت ۹ میں اللہ تعالیٰ نے اس کو اس طرح بیان فرمایا ہے: "اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ انِّي مُمِدُّكُمْ بِأَلْفٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُرْدِفِيْنَ" (یاد کرو جب تم اپنے رب سے مدد مانگ رہے تھے تو اس نے تمہیں یہ جواب دیا کہ میں ایک ہزار فرشتوں کے ذریعے تمہاری مدد کروں گا جو لگاتار پے در پے آئیں گے)۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے کامیابی کی خوشخبری پہلے ہی دے دی تھی اور کافروں کے سرغنوں کے مارے جانے کی اطلاع بھی دے دی تھی پھر آپؐ اتنی آہ وزاری سے دعا کیوں کر رہے تھے؟ اس کی کئی وجوہ ہوسکتی ہیں، ایک تو وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ اللہ کے رسولؐ کو یہ حقیقت اچھی طرح معلوم تھی کہ اللہ تعالیٰ بہت ہی بے نیاز اور مستغنی ہے، اس کے سامنے اس کے کئی نبیوں کو قتل کر دیا گیا، اس نے ان کو بچانے کا کوئی انتظام نہیں کیا جب تک کہ انہوں نے اپنے لیے دعا نہیں مانگی، اللہ کی طرف سے ملنے والی خوشخبری کے باوجود اللہ کے رسولؐ آہ وزاری سے اس لیے دعا مانگ رہے تھے کہ اللہ کی طرف سے آنے والی مدد کا حق الیقین ہو جائے، یہ حق الیقین اس وقت حاصل ہوا جب فرشتہ نے آ کر ایک ہزار فرشتوں کے اترنے کا مژدہ سنا دیا۔

دوسری وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ آپؐ نے امت کو تعلیم دینے کی خاطر ایسا کیا، امت کو یہ درس دینا تھا کہ کامیابی اگر ملے گی تو دعا ہی سے ملے گی، مسلمانوں کو چاہے کامیابی کا پورا یقین ہو، اللہ تعالیٰ سے کامیابی کی دعا مانگنی چاہیے، اس کو معمولی اور حقیر کبھی نہیں سمجھنا چاہیے، اسی طرح اپنے بارے میں یہ زعم بھی نہیں ہونا چاہیے کہ ہم تو ایمان والے ہیں، ہم تو دین دار ہیں، نماز روزہ کی پابندی کرتے ہیں، متقی پرہیزگار ہیں، اللہ تعالیٰ ضرور ہماری مدد فرمائے گا، ایسا کچھ بھی نہیں ہے، دعا کے بغیر مدد کبھی نہیں آئے گی، جب اللہ نے پیارے رسول کو نے کامیابی کی خوشخبری پہلے ہی سنا دی تھی تب بھی آپ کو زعم نہیں ہوا کہ اللہ کی مدد تو آ ہی جائے گی پھر دعا کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ جب آپ کو یہ زعم نہیں ہوا تو ہما شما کا شمار کیا، اللہ کے رسولؐ نے امت کو یہ تعلیم دی کہ کبھی بھی دعا سے بے اعتنائی نہیں کرنی چاہیے۔

تیسری وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ اللہ کے رسولؐ کو کامیابی کی امید کے باوجود اس کا اندیشہ تھا کہ جنگ تو جنگ ہی ہے جس میں ہارنے والا تو ہارتا ہی ہے، جیتنے والا بھی ہار جاتا ہے، نقصان دونوں طرف سے ہوتا ہے، اگر مان لو کہ مسلمان جنگ جیت گئے اور کافروں کے پانچ سو افراد مار ڈالے گئے تو ان پر کچھ بھی فرق نہیں پڑے گا، کیونکہ ان کے پاس لاکھوں کی تعداد میں افراد موجود ہیں، پھر وہ اپنی فوج جمع کر لیں گے لیکن مسلمانوں کی تعداد اس وقت صرف تین سو تیرہ افراد پر مشتمل تھی، وہ بھی پندرہ سال کی بڑی محنتوں اور کوششوں کے بعد تیار ہوئی تھی اللہ کے رسولؐ کو یہ ڈر تھا کہ اگر مسلمان جیت بھی گئے اور سو مسلمان شہید ہو گئے تو بھی یہ بہت بڑا خسارہ ہوگا، اس لیے اللہ کے رسولؐ کی خواہش تھی کہ جیت بھی ہو جائے اور مسلمانوں کی شہادتیں بھی کم سے کم ہوں، اسی لیے بار بار ان الفاظ کو دہرا رہے تھے کہ: "اللّٰهم إن تهلك هذه العصابة من أهل الاسلام لا تعبد" (اے اللہ! اگر یہ مسلمانوں کی چھوٹی سی جماعت ہلاک ہوگئی تو تیری عبادت نہیں کی جائے گی)، مطلب یہ کہ بڑی کاوشوں کے بعد میں

نے تیری عبادت کے لیے یہ مٹھی بھر جماعت تیار کی ہے، پوری دنیا میں کہیں بھی تیری عبادت نہیں ہو رہی ہے، اگر اس جنگ میں یہ جماعت پوری کی پوری یا اس میں سے دو تہائی یا آدھی یا ایک تہائی بھی شہید ہو گئی تو یہ بہت بڑا خسارہ ہوگا، اے اللہ! ایسا کوئی انتظام فرما کہ یہ جماعت پوری کی پوری محفوظ رہ جائے، ہلاک ہونے سے بچ جائے یا ہلاکتیں ہوں بھی تو بہت ہی کم معمولی تعداد میں ہوں، چنانچہ اللہ نے یہ دعا سن لی، اور ایک ہزار فرشتوں کی فوج مسلمانوں کی مدد کے لیے بھیج دی، ان فرشتوں نے باقاعدہ جنگ میں شرکت کی، مسلمانوں کو حوصلہ ملا، مسلمانوں میں سے صرف چودہ افراد شہید ہوئے، ستر مشرکین ہلاک ہوئے اور ستر مشرکین گرفتار ہوئے۔

اللہ تعالیٰ نے اس کا تذکرہ سورہ آل عمران آیت ۱۳ میں اس طرح فرمایا ہے: ”قَدْ كَانَ لَكُمْ آيَةٌ فِي فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِي سَبِيلِ اللهِ وَأُخرى كَافِرَةٌ يَرَوْنَهُمْ مِثْلَيْهِمْ رَأْيَ الْعَيْنِ وَاللهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهِ مَنْ يَشَاءُ (واقعتاً تمہارے لیے ایک بڑا معجزہ تھا دو گروہوں میں جب وہ دونوں ایک دوسرے کے بالکل آمنے سامنے ہوئے، ایک گروہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں جنگ کر رہا تھا اور دوسرا گروہ کافر تھا وہ ان کو اپنی آنکھوں سے اپنے سے دوگنا دیکھ رہے تھے، اللہ تعالیٰ اپنی مدد سے جس کی چاہتا ہے، تائید کرتا ہے)۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے جنگ بدر کا پورا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا ہے، سترہ رمضان کو صبح کے وقت دونوں فوجیں میدان میں جمع ہوئیں، دونوں فوجیں لائن لگا کر ایک دوسرے کے مدمقابل اس طرح کھڑی ہوئیں جیسے آج کل فٹبال کی ٹیمیں میدان میں ایک دوسرے کے مدمقابل کھڑی ہوتی ہیں، پھر کپتان ہر ایک کی جگہیں متعین کرتا ہے، عربوں کی جنگیں بڑے منظم طریقے سے لڑی جاتی تھیں، فوج کا کمانڈر یہ طے کرتا تھا کہ کون سا فوجی کس حصہ میں رہے گا، مسلمانوں کے کمانڈر خود اللہ کے رسولؐ تھے، مشرکین کا کمانڈر ابوجہل تھا، دونوں اپنی اپنی فوجوں کو منظم کرنے میں لگے ہوئے تھے، اسی دوران ایک عظیم معجزہ ظاہر ہوا جس کا تذکرہ اللہ تعالیٰ نے اس طرح فرمایا ہے: ”يَرَوْنَهُمْ مِثْلَيْهِمْ رَأْيَ الْعَيْنِ“ (وہ ان کو اپنی آنکھوں سے اپنے سے دوگنی تعداد میں دیکھ رہے تھے)۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ دونوں فریق میں سے ہر ایک دوسرے کو اپنے سے دوگنی تعداد میں دیکھ رہا تھا، یعنی مسلمان بھی کافروں کو اپنے سے دوگنے دیکھ رہے تھے اور مشرکین بھی مسلمانوں کو اپنے سے دوگنے دیکھ رہے تھے، مسلمان تین سو تیرہ تھے تو ان کو لگ رہا تھا کہ مشرکین چھ سو چھبیس ہیں، اور مشرکین ایک ہزار تھے تو وہ مسلمانوں کو سمجھ رہے تھے کہ وہ دو ہزار ہیں، یہ منظر عین لڑائی کے شروع ہونے سے ٹھیک پہلے اللہ تعالیٰ نے اس لیے دکھلایا تاکہ مشرکین کا حوصلہ پست ہو جائے اور مسلمانوں کا حوصلہ برقرار رہے، اگر مشرکین کو مسلمانوں کی صحیح تعداد کا اندازہ ہو جاتا تو ان کے حوصلے کافی بلند ہو جاتے اور بھرپور انداز میں مسلمانوں پر حملہ کر کے ان کو کافی نقصان پہنچا ڈالتے، مسلمانوں کو اپنے سے دوگنی تعداد میں دیکھ کر پہلے ہی ان کا مورال ڈاؤن ہو گیا اور ان کی شکست یقینی بن گئی۔

اس جنگ کے بارے میں ایک ایسی بات کہی جاتی ہے جو نہ قرآن پاک کے بیان سے مطابقت رکھتی ہے نہ اللہ کے رسولؐ کے مزاج سے میل کھاتی ہے اور نہ ہی اللہ کے رسولؐ کے عمل سے اس کا کوئی دور دور کا واسطہ ہے۔ وہ یہ ہے کہ اللہ کے رسولؐ شام سے آنے والے قریش کے تجارتی قافلے کو لوٹنے کے لیے مدینہ سے نکلے تھے، انہیں مکہ سے آنے والی فوج کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں تھی، قافلہ تو نکل گیا اور فوج سے اچانک سامنا ہو گیا، یہ بات صرف ایک روایت کی بنیاد پر کہی جاتی ہے جو کعب بن مالکؓ سے مروی ہے۔

قرآن کے بیان سے یہ بات قطعی مختلف اور متضاد ہے سورہ انفال آیت ۷ میں ارشاد ربانی ہے: ”وَإِذْ يَعِدُكُمُ اللهُ إِحْدَى الطَّائِفَتَيْنِ أَنَّهَا لَكُمْ“ (اور یاد کرو جب کہ اللہ تعالیٰ تم سے وعدہ کر رہا تھا کہ دو گروہوں میں سے ایک پر تم کو کامیابی حاصل ہوگی) سارے مفسرین یہ بیان فرماتے ہیں کہ دو گروہوں سے مراد ایک گروہ مکہ سے آنے والی فوج اور دوسرا گروہ شام کی طرف سے آنے والا تجارتی قافلہ ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ اللہ کے رسولؐ اور صحابہ کو فوج اور قافلہ دونوں کے آنے کی اطلاع مدینے ہی میں ہو گئی تھی اور اللہ تعالیٰ نے ان دونوں گروہوں میں سے ایک پر کامیابی حاصل ہونے کی خوشخبری مدینہ ہی میں دے دی تھی، یہ کہنا کہ مکہ سے آنے والی فوج کے بارے میں اللہ کے رسول اور صحابہ کو کوئی اطلاع نہیں تھی یہ قرآن پاک کے بیان کے سراسر خلاف ہے، ائمہ فقہاء اور محدثین کا اس پر اجماع ہے کہ جو بات قرآن کے بیان کے خلاف ہو، ناقابل قبول ہے چاہے کہنے والا کوئی بھی ہو، کیونکہ قرآن قطعی الدلالہ ہے اور حدیث ظنی الدلالۃ، جب کہ حضرت انس، حضرت علی، حضرت عروہ وغیرہ کئی حضرات سے منقول ہے کہ مدینہ ہی میں اللہ کے رسولؐ اور صحابہؓ کو مکہ کی فوج کے آنے کی اطلاع مل گئی تھی۔

دوسری بات یہ ہے کہ اللہ کے رسولؐ کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ قافلہ کو لوٹنے کے لیے نکلے تھے، یہ سراسر الزام ہے، اللہ کے رسولؐ کی ذات اقدس اس طرح کے بھونڈے اور ناپسندیدہ عمل سے قطعی مبرا ہے، آپؐ کی زندگی اور سیرت کا مطالعہ کرنے والے...

(باقی صفحہ ۱۷ پر)

عملِ پیہم

علامہ اقبالؒ - کلام اور پیام

مولانا نعیم الرحمٰن صدیقی ندوی

حکیم امت، کلیم ملت اور شاعر اسلام علامہ سر محمد اقبالؒ کی ولادت باسعادت ۹/نومبر ۱۸۷۷ء مطابق ۳/ ذی قعدہ ۱۲۹۴ھ کو سیال کوٹ (پنجاب، پاکستان) میں ہوئی۔ ان کے والد ماجد کا نام شیخ نور محمد تھا۔ وہ کشمیر کے سپروبر ہمنوں کی نسل سے تھے۔

علامہ کی ابتدائی تعلیم وتربیت سیال کوٹ میں مولانا میر سید حسن کے مدرسے میں ہوئی۔ اس کے بعد ان کی اعلیٰ تعلیم مرے کالج سیال کوٹ، کیمبرج یونی ورسٹی، انگلستان، میونخ یونی ورسٹی، جرمنی، گورنمنٹ کالج یونی ورسٹی لاہور، پاکستان، ہائیڈل برگ یونی ورسٹی، جرمنی اور اورینٹل کالج لاہور میں ہوئی۔

تکمیل درسیات کے بعد وہ ایک فلسفی، مصنف، شاعر، ادیب، مترجم، سیاست داں، وکیل، مفکر اور دانائے راز کی حیثیت سے مشہور ومعروف ہوئے۔

ان کے کلام بلاغت نظام کے مجموعے، اسرار خودی، رموز بے خودی، پیام مشرق، بانگ درا، زبور عجم، جاوید نامہ، بال جبریل، ضرب کلیم، پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق اور ارمغان حجاز فارسی او رارد و میں مشہور ومقبول ہیں۔ ان کے اردو کلام کا مجموعہ ''کلیات اقبال'' ہے جو اپنی محبوبیت و مقبولیت میں اپنی مثال آپ ہے۔

علامہ اقبال اپنے اعلیٰ اسلامی افکار، نظریات و خیالات، فلسفہ خودی، مغربی تہذیب وتمدن پر تعمیری تنقید اور مشرقی واسلامی تہذیب، ثقافت اور تمدن کی مدافعت نیز ان کا تفوق ثابت کرنے کے لیے نمایاں ہیں۔

طلوع اسلام، مسجد قرطبہ، ساقی نامہ، شکوہ جواب شکوہ اور بچے کی دعا ''لب پہ آتی ہے دعا'' جیسی ان کی نظمیں بہت مقبول ہیں۔ ان کا لکھا ہوا ترانہ وطنی ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' حب الوطنی کے باب میں ایک مثال ہے۔ اسی طرح ان کا ترانہ ملی ''چین وعرب ہمارا ہندوستاں ہمارا'' آج بھی سروں میں جوش اور دلوں میں ولولہ پیدا کر دیتا ہے۔ ''ہندوستانی بچوں کا قومی گیت''، ''رام'' اور ''نیا شوالہ'' نامی نظمیں آج بھی معاشرے میں قومی یک جہتی، مذہبی ہم آہنگی، باہمی رواداری، آپسی اتحاد، ہندو مسلم بھائی چارہ، قدیم ترین گنگا جمنی تہذیب اور وطن عزیز کی مشترک ثقافت کو فروغ دینے اور اس کی حفاظت کا کام خوش اسلوبی سے کر رہی ہیں۔

مولانا عبد الماجد دریابادیؒ دہلی ریڈیو اسٹیشن سے نشر اپنے ایک نشریے میں ''شکوہ اور جواب شکوہ'' کا مختصر تجزیہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''جو زبان خوگر تھی حمد وثنا ومناجات کی، وہ آخر اک بار گلے وشکوے پر کھلی۔ یا یوں کہیے کہ کھلوائی گئی۔ آقا کا کرم جب خود ناز برداری پر آمادہ ہو جائے تو کون بندہ ہے جو ''نیاز'' کے فرش زمیں کو چھوڑ کر ''ناز'' کی فضا میں نہ اڑنے لگے۔ عبدیت کی دنیا میں سنتے ہیں کہ گریہ یعقوبؑ کے ساتھ ساتھ ایک منزل تبسم سلیمانیؑ کی بھی تو آتی ہے۔

اقبال کے شکوے میں (شاعر اس وقت تک شاعر اسلام بن چکا تھا) بندہ اپنے خالق سے گویا روٹھ کر کہتا ہے کہ واہ بے گانوں پر، باغیوں پر، سرکشوں پر تو لطف ونوازش کی یہ بارشیں اور ہم اہل توحید کی یہ حالت زار، کیا یہی ہماری وفا کیشی کا صلہ ہے؟ یہی ہماری توحید پرستی کا انعام ہے؟

کون سی قوم فقط تیری طلب گار ہوئی؟
اور تیرے لیے زحمت کش پیکار ہوئی؟
کس کی شمشیر جہانگیر جہاندار ہوئی؟
کس کی تکبیر سے دنیا تیری بیدار ہوئی؟

لیکن ''شکوہ'' نام ہی کا شکوہ ہے، مضمون وہی حمد و مناجات کا اس لفافہ کے اندر بھی موجود ہے۔ ہر طنز میں عبدیت کی چاشنی، ہر گلے میں توحید پرستی کی شیرینی۔

اقبال کی اردو شاعری کی شہرت وعظمت کی اصل بنیاد یہی شکوہ ہے۔ خوب چلا، خوب پھیلا۔ جو کچھ بھی نہ سمجھے انہوں نے بھی مزے لے لے کر پڑھا اور جو مطلب بالکل الٹا سمجھے، انہیں تو اپنی گویا آزاد خیالی کے لیے ایک سند ودستاویز ہاتھ آ گئی۔

حکیم ملت کہ ملت کا نباض تھا، قوم کے رگ وریشے سے واقف تھا، بھانپ گیا کہ جو آب حیات کا قطرہ تھا وہ شیشوں اور گلاسوں تک پہنچتے پہنچتے زہر کی بوند بن گیا۔ معاً پلٹا اور شکوہ کے جواب میں ''جواب شکوہ'' کہہ ڈالا۔ جوش وخروش وہی، زور بیان وہی۔ البتہ حقائق زائد۔ حقیقتوں کی تعبیر کھلی ہوئی اور صداقتوں کا اظہار فاش و برملا۔ جواب کا حاصل یہ ہے کہ وہ ''وعدے تو مسلموں اور پرستاران توحید کے لیے تھے، تم مسلم اور موحد ہو کب؟ نظر قال پر نہیں اپنے حال پر کرو۔ اپنے اعمال پر کرو''۔

باپ کا علم نہ بیٹے کو اگر ازبر ہو
پھر پسر قابل میراث پدر کیوں کر ہو؟
حیدری فقر ہے، نے دولت عثمانی ہے
تم کو اسلاف سے کیا نسبتِ روحانی ہے؟

عوام اپنے جذبات کی ترجمانی ''شکوہ'' میں زیادہ پاتے ہیں اس لیے پست مذاق طبقہ آج تک

شکوہ پسند ہی چلا آرہا ہے، حالاں کہ ''جوابِ شکوہ'' کی سطح ''شکوہ'' سے کہیں بلند ہے۔ ''شکوہ'' والا اقبال ایک صاحب حال سالک ہے ''جوابِ شکوہ'' والا اقبال ایک صاحب مقام عارف ہے۔ پہلے کے قدم اقلیم کی وادیوں میں۔ دوسرے کی نگاہ فضائے روح کی بلندیوں میں''۔

(ملاحظہ ہو: نشریات ماجدی ص ۴۱، ۴۲)

علامہ اقبال آج بھی اردو والوں کے دل و دماغ میں رہتے ہیں۔ علم و دانش، تفکر و تدبر اور حکمت و دانائی سے لب ریز ان کی نظمیں اور اشعار علمائے کرام، اساتذہ کرام، مقررین اور اہل قلم کی تحریروں اور تقریروں کی جان ہوتے ہیں۔ بیت بازی میں طلبائے عزیز ان کے اشعار بڑے اہتمام سے سناتے ہیں اور فاتح قرار پاتے ہیں۔

اقبال نے اسلام کی آفاقی تعلیمات کی تبلیغ و اشاعت کا ذریعہ اپنی شاعری کو بنایا۔ اسلامی نشاۃ ثانیہ کی خواہش، ملت اسلامیہ کی شان و شوکت کی بازیافت، اس کی فلاح و بہبود، تعمیر و ترقی اور نوجوانوں میں بیداری ان کی شاعری کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ ان کا مرکزی موضوع نوجوانانِ ملت ہیں۔

انہوں نے اپنے کلام میں گل و بلبل، پروانہ و شمع، کبوتر اور ہرنی اور دیگر پامال استعارے استعمال نہیں کیے۔ ان کی جگہ ان کو اپنے مثالی نوجوان کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل کے لیے شاہین سے بہتر کوئی استعارہ نہیں ملا۔ وہ کہتے ہیں:

اس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی
ہو جس کے جوانوں کی خودی صورتِ فولاد

شاہیں کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا
پُر دَم ہے اگر تُو تو نہیں خطرۂ افتاد

وہ نوجوان سے کہتے ہیں:

کر بلبل و طاؤس کی تقلید سے توبہ
بلبل فقط آواز ہے طاؤس فقط رنگ

ستاروں پر کمندیں ڈالنے والے، بے داغ کردار کے حامل، بہترین سیرت و اخلاق کے پیکر، بہادر، باحمیت اور غیور نوجوان شاعر اسلام کے پسندیدہ شخصیات ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

علامہ اپنی شاعری کے ذریعے یہ سمجھاتے ہیں کہ بندہ مومن کسی کا غلام نہیں ہوسکتا۔ وہ غدار اور منافق نہیں ہوسکتا۔ اس نے کلمہ طیبہ کی روح چھوڑ دی ہے، اس لیے اس کی نمازیں بے اثر ہیں۔ اس کے رکوع و سجود بے کیف ہیں۔ اس کے قیام و قعود بے رنگ ہیں۔ اس کے روزے بے مزہ ہیں۔ اس کی زکوٰۃ بے سود ہے۔ اس کے حج بے معنی ہیں۔ اس کی کائنات بے رونق ہے۔ کبھی محبت الٰہی اس کی اصل پونجی تھی، کبھی عشق رسولؐ اس کا حقیقی سرمایہ تھا۔ اب حب دنیا اس کی اساس اور خوف مرگ اس کی شناخت ہے۔ عصر حاضر کے افکار و نظریات نے اس سے ذوق و شوق، تب و تاب، سوز و ساز، کیف و کم اور درد و گداز کی متاع گراں مایہ چھین لی ہے۔ اس کا علم و فن، عقل و قلب، صلاحیت و اہلیت اور دیگر اوصاف عالی سب مادی نصب العین کا طواف کر رہے ہیں۔

وہ کہتے ہیں کہ دور حاضر میں نوجوان تشنہ لب ہیں۔ ان کا جام شعور شراب آگہی سے خالی ہے۔ مایوسی، ناامیدی، بے یقینی، بے سمتی، پست ہمتی، حوصلے کے فقدان، خود فراموشی اور سب سے بڑھ کر خدا فراموشی نے ان کی صلاحیتوں کو سلب اور اہلیتوں کو غصب کر لیا ہے۔

علامہ اقبال کو گفتار کے سورما نہیں کردار کے غازی محبوب ہیں۔ ان کے افکار و نظریات اور تعلیمات کے مطابق اگر ہمارے نوجوان عیش پسندی، تن پروری، آرام طلبی، بے راہ روی، بے فکری اور غیر منظم طرز زندگی ترک کر دیں تو بلاشبہ ان کی زندگیوں میں زبردست انقلاب آجائے گا۔ ایک ایسا خاموش اور موثر انقلاب جو ملت اسلامیہ کی ہمہ جہت فلاح و بہبود، تعمیر و ترقی، خوش حالی و سرخ روئی اور سربلندی کا نقیب و ضامن ہوگا۔

شاعر مشرق کی وفات حسرت آیات ۶۱ برس کی عمر میں ۲۱/اپریل ۱۹۳۸ء مطابق ۲۰/صفر ۱۳۵۷ھ کو اپنے مکان جاوید منزل لاہور میں ہوئی اور بادشاہی مسجد لاہور کے پہلو میں تدفین ہوئے۔

☆☆☆

مشہور عالم و خطیب قاری ریاض الحسن ندوی مظاہری کا انتقال

۱۸/اپریل ۲۰۲۶ء کو بروز سنیچر مظاہر علوم وقف سہارنپور کے استاذ تفسیر و ادب مولانا قاری ریاض الحسن مظاہری ندوی دارِ فانی سے کوچ کر گئے، انا للہ و انا الیہ راجعون۔ مولانا مرحوم اپنی زبان و ادب اور خوبصورت خطابت کی وجہ سے بطورِ خاص معروف اور گوناگوں صلاحیتوں کے مالک تھے۔ اپنی تدریسی صلاحیتوں سے جہاں انہوں نے مدرسہ مظاہر علوم وقف کو فائدہ پہنچایا، وہیں اپنی موثر خطابت سے دعوتِ اسلامی اور اصلاح معاشرہ کے میدان میں قابل قدر خدمت انجام دی، اور اپنی خوش اخلاق طبیعت اور دلنشیں گفتگو سے سب کو متاثر کیا۔

ارحم الراحمین کی ذات سے امید کرتے ہیں کہ مولانا کی حسنات و خدمات کو قبول فرمائے اور متعلقین و اہل خانہ کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین۔

فکروعمل

علی گڑھ میں علامہ شبلیؒ کا علمی وفکری کردار

مولانا عبدالمتین ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

علامہ شبلی نعمانیؒ کی تعلیم وتربیت جس ماحول میں ہوئی اور جن لوگوں سے آپ کا میل جول تھا وہ خالص مذہبی اور قدیم ذہن و دماغ رکھنے والے لوگوں سے تھا، علی گڑھ میں آنے سے پہلے آپ کی تگ ودو کا جو میدان تھا وہ بھی فرسودہ اور از کار رفتہ تھا، وہی قراءت خلف الامام اور آمین بالجہر کا مسئلہ جو سیکڑوں سال سے پرانا ہو چکا تھا، اس میں نت نئے طریقے سے موشگافیاں پیدا کی جارہی تھیں اور اس کی وجہ جماعت المسلمین تفرق وتشتت کا شکار ہورہی تھی۔ چنانچہ اسی کا اظہار کرتے ہوئے اپنی ایک تقریر میں فرماتے ہیں:

''حضرات! یہ سچ ہے کہ میری زندگی کا کوئی حصہ علمی یا تعلیمی زندگی قرار پا سکتا ہے تو اس کا آغاز، اس کی نشوونما، اس کی ترقی، اس کی نمود، اس کا امتیاز جو کچھ ہوا ہے اس کالج سے ہوا ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ یہاں آنے سے پہلے میں نے تصنیف کے دائرے میں قدم نہیں رکھا تھا، یہ سچ ہے کہ آج سے بہت پہلے میری دو تین کتابیں چھپ چکی تھیں اور شائع ہو چکی تھیں لیکن ان کا ایک مقصد تھا اپنے مذہبی جھگڑے بڑھانا، مسلمانوں کی جماعت منتشر کرنا اور جو انتشار پہلے سے موجود تھا اس کو قوت اور استحکام دینا''۔

(ماخوذ از مضمون محمد امین زبیری)

علی گڑھ آپ کے لیے ایسی ایک جگہ تھی جہاں پرانے خیالات، پرانی طرزِ حیات کی کوئی جگہ نہ تھی، جہاں مختلف الادیان، مختلف بودوباش کے لوگ رہتے تھے۔ ایسے ماحول میں ایک پرانے طرز کا بوریا نشین عالم جس نے کبھی انگریزی کا ایک حرف نہ پڑھا ہو، نہ کبھی انگریزوں کی صحبت اختیار کی ہو، نہ جن پر کبھی نئی تہذیب وتمدن کا سایہ پڑا ہو، وہ یکا یک کس طرح اس ماحول میں سما گیا اور کہیں سے بیگانہ نہ ہونے پایا، یہ خود ایک بڑا کمال ہے۔ اور نہ صرف یہ کہ اس ماحول میں رچ بس گئے اور نئے علوم وفنون کے اہلِ کمال سے مرعوب نہیں ہوئے بلکہ اپنے پرانے علوم وفنون کے مرتبے کو ان کی نگاہ میں اتنا بلند کر دیا کہ آرنلڈ اور ان جیسے دوسرے باکمال انگریز پروفیسروں کو ان کی تحسین بلکہ تحصیل پر مجبور کر دیا۔ اور ایسے زمانے میں جب کہ کالج میں ہر طرف سے نئے علوم، نئے مسائل، نئی تحقیقات کی بارش ہورہی تھی، ایک علامہ ہی کا وجود تھا جو مسلسل اس طوفان میں اسلامی علم وفن کے منارے کو مضبوطی سے اپنی جگہ جمائے ہوئے تھے کہ ان کو اس طوفان خیز سیلاب سے کوئی خطرہ نہ رہا۔

پھر جس زمانے میں علامہ نے کالج میں قدم رکھا وہ کالج کا ایسا دور تھا جہاں انگریزی پڑھنا اور انگریزیت کو اپنانا آخری درجے کی معراج تھی، جہاں جدید علوم وفنون کے ہوش ربا مناظر ہر وقت نگاہوں سے گزرتے رہتے تھے۔ ایسے ماحول میں طلبہ کے اندر قدیم علوم، فارسی اور عربی ادب کا ذوق پیدا کر دینا کتنا مشکل کام تھا، لیکن مولانا نے یہ ذوق ان کے اندر پیدا کیا اور اس فریضے کو اس ہنرمندی اور سلیقہ مندی سے انجام دیا کہ کئی ہونہار طلبہ نے ان علوم میں ناموری حاصل کی۔ مولانا حمیدالدین فراہی، مولوی بہادر علی اور مولوی داؤد صاحبان اس کی واضح مثالیں ہیں۔

اسی طرح آپ نے طلبہ میں قرآن کا درس دینا شروع کیا اور اس درس کو ایسا دلچسپ بنا دیا کہ بڑی تعداد میں طلبہ اس درس میں شریک ہونے لگے۔ اس درس میں قرآن پاک کے اصول و بلاغت اور اس کے صنائع وبدائع بتاتے اور اس کی مثالوں میں فارسی کے ایسے ایسے اشعار سناتے کہ لوگوں کو وجد آنے لگتا۔

انگریزی طلبہ میں مذہبی رنگ پیدا کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا، لیکن مولانا نے یہ کام بھی بحسن خوبی انجام دیا۔ اس کا بیان خود انہی کی زبان سے سنیے۔ فرماتے ہیں:

''اس وقت مجھ سے نہ میری طبیعت کا حال پوچھیے نہ کوئی اور واقعہ، آپ سنیے اور میں دل سے اٹھتے ہوئے جوش سے ایک تازہ کیفیت سناؤں۔ یوں تو مدرسۃ العلوم کے قواعد میں داخل ہے کہ لڑکے مغرب کی نماز جماعت سے پڑھیں مگر ان دنوں ہوا کا رخ ہی بدل گیا ہے۔ لڑکوں نے خود ایک مجلس قائم کی ہے جس کو وہ لجنۃ الصلاۃ کہتے ہیں۔ ایک بی اے سیکرٹری ہے اور بہت سے تعلیم یافتہ اس کے ممبر ہیں۔ چار بجے صبح کے بعد ایک نوجوان انگریزی خواں لوگوں کو اس پر اثر فقرے سے چونکا دیتا ہے ''الصلوۃ خیر من النوم''۔ پانچوں وقت کی نمازیں باجماعت ہوتی ہیں اور لطف یہ کہ محض اپنی خواہش سے، بیرونی دباؤ کا نام بھی نہیں۔ مغرب کی نماز سبحان اللہ کیا شان وشوکت سے ہوتی ہے کہ دل پھٹا پڑتا ہے۔ خود سید صاحب بھی شریکِ نماز ہوتے ہیں اور چونکہ وہ عامل بالحدیث ہیں آمین زور سے کہتے ہیں۔ ان کی آمین کی گونج مذہبی جوش کے

رنگ میں خون بڑھا دیتی ہے''۔
(مکاتیب محمد عمر، مکاتیب شبلی، صفحہ نمبر ۴۶، ۴۷)

یہ تو مذہبی بیداری کا حال تھا، جس میں علامہ شبلی نعمانی مرحوم نے زبردست کارنامے انجام دیے، اسی طرح آپ کی ذات سے پورا کالج سرتاپا علمی ماحول میں تبدیل ہوگیا اور مجموعی اعتبار سے طلبہ میں پڑھنے لکھنے کا ذوق پیدا ہوگیا اور ان کی زندگیوں میں علمی رنگ نمایاں ہوا، اور آپ کی فیضِ صحبت سے بڑے بڑے انشاء پرداز، سخن سنج وسخن فہم پیدا ہوئے۔ اس سلسلے میں مولوی عزیز مرزا، خواجہ غلام الثقلین، مولوی عبدالحق ناظم انجمن ترقی اردو، سید سجاد حیدر یلدرم، مولوی محفوظ علی بدایونی صاحب، شیخ محمد عنایت اللہ صاحب، مولوی ظفر علی خان صاحب وغیرہم کے اسماء گرامی لیے جاسکتے ہیں جو اسی آب وہوا کی پیداوار ہیں۔ انہی قابل ذکر ہستیوں میں ایک ہستی مولوی مسعود علی صاحب بی اے المتخلص بحوی کی ہے جو حیدرآباد دکن میں جج تھے، بعد میں دارالترجمہ میں رہے، وہ فارسی کے خوش مذاق شاعر تھے۔ اس فیض صحبت اور فیضِ تعلیم کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''علی گڑھ کالج کے بی اے کلاس کے فارسی نصاب میں قاآنی کے چند قصائد داخل تھے، مولانا شبلی فارسی کے پروفیسر تھے۔ مولانا مرحوم ان نادر الوجود استادوں میں تھے جو نہ صرف کسی مضمون کو پڑھا اور سمجھا دیتے بلکہ اس مضمون کے ساتھ شاگردوں میں حقیقی دلچسپی پیدا کرنے میں ملکہ رکھتے تھے۔ مولانا مرحوم ومغفور کی دلچسپ صحبت اور شاگردی کا یہ اثر ہوا کہ ہم میں سے بعض طلبہ ٹوٹی پھوٹی نظم لکھنے لگے، اور سب نے قاآنی کا طرز اختیار کیا۔ کالج سے نکلنے کے بعد بعض ساتھی تو شعر گوئی کی علت سے پاک وصاف ہوگئے اور بعض نے فارسی چھوڑ کر اردو کی طرف توجہ کی اور اچھے شعر کہنے لگے، مگر میں اس علت کے قدیم جراثیم اپنے دماغ سے نکالنے میں آج تک کامیاب نہ ہوسکا''۔
(حیات شبلی صفحہ نمبر ۱۵۱، ۱۵۲)

مولانا حبیب الرحمن شیروانی فرماتے ہیں:

''مجھ کو بھی اگر کچھ لکھنا آیا تو انہی کی صحبتوں کے اثر سے، تاریخ وادب فارسی کا ذوق یہیں نشوونما پذیر ہوا ہے اور جو طلبہ شاعر نہ بن سکے وہ مولانا کے ترنم کی نقل اتار کر ایسی نظم خوانی کرنے لگے کہ جس مجلس میں پڑھتے اپنا اثر ڈالے بغیر نہ رہتے۔ مولانا کی شاعری سے نہ صرف طلبہ کو بہت زیادہ فائدہ پہنچا بلکہ یہ چیز خود کالج کی ناموری اور اس کی شہرت میں بھی بہت زیادہ مدد ومعاون ثابت ہوئی، اور جو بھی امراء و اکابر کالج آتے، مولانا اپنی شاعری نہیں، ساحری کے ذریعے کالج کی ہمدردی اور اعانت کی طرف ان کو متوجہ فرماتے۔ کبھی آپ اس کو غرناطہ، کبھی اصفہان، کبھی بغداد بتاتے تو کبھی اس کو مسلمانوں کی علمی ترقیوں کا امیدگاہ ٹھہراتے تھے۔''(حیات شبلی صفحہ نمبر ۱۵۲، ۱۵۳)

علاوہ ازیں آپ نے پے در پے محققانہ مضامین اور تعلیمی کانفرنس کے خطبے اور عالمانہ تصانیف کے ذریعے نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری دنیا میں کالج کی شہرت کا سامان بہم پیدا کیا۔ اس زمانے میں چونکہ کالج ہر قسم کی علمی و ادبی تحقیقات کا مرکز تھا، یہاں سے نئی نئی تصنیفات شائع ہوتیں اور محققانہ مضامین کی اشاعت ہوتی، اس لیے یہ تصنیفات ومضامین مصر وشام جہاں بھی گئے کالج کی شہرت کے دائرے کو بڑھاتے چلے گئے۔ والیان بھوپال وحیدرآباد کالج کے ساتھ حسنِ ظن پر اس کی امداد واعانت کی طرف ان کا التفات وتوجہ کی سب سے بڑی وجہ علامہ ہی کی تصنیفات تھیں۔ پھر علامہ جب تک علی گڑھ میں مقیم رہے اپنی تصنیفات سے ایک حبہ برابر بھی فائدہ نہیں اٹھایا، حالانکہ ان تصنیفات کی مقبولیت وشہرت کا یہ عالم تھا کہ تین تین ہی مہینے میں اس کا پہلا ایڈیشن ختم ہوجاتا۔ اس طرح آپ نے کالج کی معنوی منفعت کے ساتھ ساتھ مادی منفعت سے بھی کالج کو بہرہ ور کیا۔ اس کا اعتراف خود سر سید نے اپنے ایک خط میں کیا ہے۔

چنانچہ لکھتے ہیں:

''۵۰ نسخے المامون کے میں نے خدمت عالی میں روانہ کیے ہیں۔ مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم کے نسخے صرف معدودے چندرہ گئے ہیں، اس لیے وہ نہ بھیج سکا۔ آپ نے جو کتابوں کو خرید فرمایا غالباً آپ کو خیال ہوگا کہ ایک اعانت مولوی شبلی کی ہے، مگر مولوی شبلی نے یہ کتابیں مع حقِ تصنیف وغیرہ کالج کی نذر کردی ہیں۔ ان کی قیمت یا منافع سے ایک حبہ کا فائدہ انہوں نے حاصل نہیں کیا، اور آئندہ جو کچھ بھی وہ لکھ رہے ہیں صرف کالج کے فائدے کے لیے لکھتے ہیں، اپنا ذاتی فائدہ ان کو مقصود نہیں۔ ایسے جاہل آدمی ہیں کہ انھوں نے چند نسخے المامون کے بلا قیمت اپنے دوستوں کو بھیجنا چاہے، میں نے ہر چند اصرار کیا کہ جس قدر تمہارا دل چاہے لے لو تو ہرگز نہ مانا، مجھ سے خریدی اور اپنے دوستوں کو بھیج دیں''۔(حیات شبلی صفحہ نمبر ۲۰۵)

اسی طرح علامہ شبلی جب تک علی گڑھ میں مقیم رہے اور اس کے بعد بھی علی گڑھ کے ماتحت منعقد ہونے والی محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی، جو پہلے ایجوکیشنل کانگرس کے نام سے موسوم تھی، اپنے علمی مقالوں اور پُراثر تقریروں کے ذریعے خدمت کی۔ چنانچہ کانفرنس کے دوسرے اجلاس میں جو کہ علی گڑھ میں منعقد ہوا اور اس کے صدر نشین سمیع

اللہ خان تھے، آپ نے اس میں اپنا مشہور مقالہ ''مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم'' پڑھا۔ اس مقالے نے گویا لوگوں کی نگاہیں کھول دیں اور لوگوں کو پہلی بار اپنے اسلاف کے بارے میں اس طرح کی معلومات بہم پہنچائیں۔

اسی طرح کانفرنس کا جب پانچواں اجلاس ۱۸۹۱ء میں الہ آباد میں ہوا جس میں بڑے بڑے آسمانِ علم وفن موجود تھے۔ اسی اجلاس میں بالاتفاق یہ رائے پاس ہوئی کہ مسلمانوں نے عہدِ عروج میں جو علوم وفنون یونان، مصر و ہندوستان سے حاصل کیے، اس پر مفصل ایک رسالہ لکھوایا جائے۔ اس کے لیے جس شخصیت پر لوگوں کی نگاہیں اٹھیں وہ علامہ شبلی تھے۔ تمام مجمع سے بالاتفاق یہی آواز آئی کہ مولوی شبلی لکھیں گے، مولوی شبلی لکھیں گے۔ (اردو کانفرنس الہ آباد صفحہ نمبر ۱۹۱)

اس تجویز کا خاکہ مولانا کے ذہن میں ۱۸۸۷ء میں آ چکا تھا۔ چنانچہ آپ نے ''مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم'' کے ایک حاشیے پر لکھا کہ اگر زمانے نے مساعدت کی تو ان تمام باتوں کی تفصیلات کہ جب مسلمانوں کو یہ علوم ملے تو ان علوم کی حالت کیا تھی اور جب مسلمانوں نے ان علوم کو اپنایا تو کس قدر اس کو بامِ عروج پر پہنچایا۔ لیکن مولانا کو یہ موقع نہ مل سکا اور نہ ہی اس سے متعلق کوئی مستقل کتاب لکھی۔ البتہ بعد میں الندوہ میں یونانی منطق اور یونانی فلسفہ سے متعلق متعدد مضامین لکھے۔

۱۸۹۹ء میں کانفرنس کا اجلاس کلکتہ میں ہونا طے پایا۔ بقول شیروانی لفٹننٹ گورنر نے اصرار کے ساتھ اس کانفرنس میں شرکت کے لیے درخواست کی، جبکہ سرسید کا بھی انتقال ہو چکا تھا اور آپ علی گڑھ کی ملازمت بھی چھوڑ چکے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کلکتہ یونیورسٹی اپنے بی اے کے نصاب سے فارسی کو نکال دینا چاہتی تھی اور اس کی وجہ یہ بتائی جا رہی تھی کہ فارسی زبان کلاسیکل زبان نہیں ہے اور نہ ہی اس کے اندر قوتِ متخیلہ کی تربیت کرنے کی وہ طاقت ہے جو دوسری زبانوں میں ہے۔

علامہ نے بزورِ دلائل یہ ثابت کیا کہ فارسی زبان میں بھی وہ تمام شاخیں جو عربی زبان میں ہیں، فارسی زبان میں بھی موجود ہیں بلکہ بعض باتوں میں وہ فائق ہے۔ چند تصنیفات اس میں ایسی ہیں جس کی نظیر عربی زبان میں بمشکل ملے گی، مثلاً فردوسی کی تصنیف ''شاہنامہ'' جو کہ فارس کے زمانۂ سلف کی قابلِ اعتبار تاریخ ہے۔ اسی طرح فارسی میں ایک چیز اور ایسی ہے جو عربی میں نہیں پائی جاتی، وہ ہے بادشاہوں اور شہنشاہوں کی خود نوشت سوانح عمری اور روزنامچے۔''

(حوالہ: باقیات شبلی صفحہ نمبر ۵۷/۵۸)

مولانا کی یہ تقریر اتنی مدلل اور پُرزور تھی کہ لوگ حیران وششدر رہ گئے اور پورے مجمع پر سناٹا چھا گیا۔ اس وقت بنگال کے لفٹیننٹ گورنر سر آوڈ برن جو اس مجمع میں موجود تھے، اس تقریر سے اتنے زیادہ متاثر ہوئے کہ اس نے سرعام اپنی انگریزی تقریر میں کہا کہ میرے اندر اتنی قابلیت نہیں کہ میں مولانا شبلی جیسی پُرتاثیر تقریر کرسکوں۔

(حوالہ: حیات شبلی صفحہ نمبر ۲۱۱)

مذکورہ بالا سطور سے یہ بات اظہر من الشمس ہوگئی کہ علامہ شبلی جب تک علی گڑھ میں مقیم رہے ہمیشہ اپنے ذاتی مفاد سے بلند ہو کر قوم وملت کے مفاد اور اس کی اصلاح کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے اور دامے، درمے، سخنے ہر طرح سے قوم کو فائدہ پہنچانے کی کوشش کی۔

☆☆☆

بقیہ: جنگ بدر

اچھی طرح جانتے ہیں کہ آپؐ نے اپنی پوری زندگی میں نہ کسی کا مال چرایا نہ لوٹا نہ غصب کیا نہ بددیانتی کی، نہ چھینا نہ جھپٹا اور نہ کبھی اس کا ارادہ فرمایا، ایسے پاک باز اور شریف ترین انسان کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ قافلہ لوٹنے کے لیے نکلے تھے، یہ سراسر آپؐ پر سنگین الزام ہے، آپؐ کا رویہ دوستوں اور دشمنوں کے ساتھ بالکل یکساں تھا، اللہ کے رسولؐ ہرگز ایسے نہیں تھے کہ قافلہ کے لوٹ مار کرنے کا ارادہ بھی فرماتے۔

تیسری بات یہ کہ جب اللہ کے رسول صحابہ کو لے کر مدینہ سے نکلے تو سیدھے جنوب کی طرف چلنے لگے، اگر قافلہ کو لوٹنا ہوتا تو آپ یا تو شمال کی طرف چلتے یا پھر مغرب کی طرف کیونکہ تجارتی قافلہ شمال کی طرف سے آ رہا تھا اور شام سے مکہ جانے والا راستہ مغربی سمت سے گزرتا تھا، قافلہ کا راستہ روکنے اور اس کو لوٹنے کے لیے سب سے زیادہ مناسب تھا کہ آپؐ مغربی سمت میں جاتے، آپؐ نہ تو شمال کی طرف گئے اور نہ مغرب کی طرف بلکہ آپ سیدھے اسی راستہ پر چلے جو مکہ کی جانب جاتا ہے، اس راستہ میں قافلہ سے مڈبھیڑ ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ قافلہ کو لوٹنا آپؐ کے پیش نظر تھا ہی نہیں، بلکہ آپؐ کا مقصد اس فوج کو مدینہ کے قریب آنے سے روکنے کا تھا جو مسلمانوں کا مکمل صفایا کرنے کے ارادہ سے مدینہ کی طرف تیزی سے بڑھتی چلی آ رہی تھی، جب بدر کے مقام پر آپؐ پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہ تقریباً چار سو کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے بدر کے قریب آ چکی ہے تو آپؐ نے بدر ہی میں قیام کرنا مناسب سمجھا، اس طرح آپؐ کے عمل سے بھی کسی طرح یہ نہیں لگتا کہ آپؐ قافلہ کو لوٹنے کے ارادہ سے نکلے تھے۔

☆☆☆

سیرت پاک

بشر ہیں بے خبر ہیں۔۔۔

مولانا عبدالرحیم ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

غار حراء کی روشنی چمکے دس سال پورے ہو رہے ہیں، سراج منیر گم کردہ راہوں کو سیدھی راہ دکھانے میں مصروف ہے، بازاروں میں میلوں میں جا جا کر مشعل دکھا رہا ہے، نصیب والے ایک ایک کر کے اس آفتاب عالم تاب کی کرنوں سے نہاں خانۂ دل کو منور کر رہے ہیں، بدنصیب وہ ہیں جو اجالے سے بھاگتے ہیں، روشنی سے بدکتے ہیں، ان کی تیرہ بختی کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے، جو سورج کے سامنے آنکھیں موند لیتے ہیں، بلکہ اس کی خیرہ کن شعاعوں کو بجھانے کے درپے ہیں، لیکن جن کی نگاہیں اس سے چار ہوگئی ہیں کیسے اس کا انکار کر سکتے ہیں؟ جنہوں نے آگ کی حرارت محسوس کر لی ہے، کیسے اس کو جھٹلا سکتے ہیں، چاہے ان کو جلتی ریت پر لٹاؤ یا دہکتے انگاروں پر سلاؤ، ناک میں دھونی دو یا گلے میں رسی باندھ کر گلی کوچوں میں گھماؤ، وہ تو سورج کی روشنی اور آگ کی حرارت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہیں۔

قریش مکہ ہیں کہ ایجابی، سلبی، منفی و مثبت ترغیبی و ترہیبی ہر طرح کی کوشش کیے جا رہے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنا مشن ترک کر دیں، لیکن ابھی تک اصحاب محمد کی طرح ﷺ پر ہاتھ اٹھانے کی جرأت نہیں کر سکتے ہیں، شاید ان ظاہر بینوں کی نگاہ میں ابوطالب کا وجود مانع ہو رہا ہے، لیکن نبوت کے دسویں سال یہ سہارا بھی جاتا رہا، یعنی حضرت خدیجہؓ و ٹوٹے دل کو ڈھارس بندھانے والی تھیں، اور چچا ابوطالب جو ظاہری سہارا تھے۔ یکے بعد دیگرے داغ مفارقت دے جاتے ہیں۔

اب قریش مکہ کے لیے راستہ بالکل صاف ہو گیا، وہ جتنا چاہیں اپنے غیظ وغضب کی تسکین کریں، جس انداز سے چاہیں حضور ﷺ کو ستائیں، کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں ہے، چنانچہ قریش نے عزت پر، آبرو پر، جسم پر، جان پر حملوں کی کوئی قسم باقی نہیں چھوڑی، غرض جو کچھ کر سکتے تھے سب کچھ کیا، ترکش کے ہر تیر کو آزما لیا، لیکن یہ مرد خدا انہیں آندھیوں کے جھکڑ اور طوفان کے تھپیڑوں میں قندیل رہبانی روشن کرتا رہا، ایک دن خیال آیا کہ یہ تیرہ بخت نہیں سنتے، شاید دوسرے سنیں، یہ نہیں مانتے شاید دوسرے مانیں، کچھ یہی سوچ کر قریب کی بستی طائف کا رخ کیا۔

کار ہے نہ موٹر، گھوڑا ہے نہ خچر، ایک غلام کے سوا نہ کوئی رخت سفر، اسی بے سروسامانی کے عالم میں ستر پچہتر کلومیٹر کی مسافت طے کی، نہ جانے کتنی مشقتوں کا سامنا کرنا پڑا ہوگا، کیسی کیسی دشواریوں سے گزرنا پڑا ہوگا، لیکن نہیں معلوم کس طرح دل میں تمناؤں کا ایک شیش محل سجائے ہوئے حق کا یہ متوالا اس وقت کے مہذب اور قدرے متمدن لوگوں کے پاس پہنچتا ہے اور دس دن تک وہاں کے شرفاء وسربرآوردہ لوگوں کے سامنے کمال رأفت و رحمت اور سوز و گداز کے ساتھ اپنا مدعا عرض کرتا رہا، لیکن انہوں نے نہ صرف یہ کہ بڑی بے دردی سے آپ کی دعوت کو ٹھکرا دیا بلکہ شہر کے اوباش لڑکوں کو آپ کے پیچھے لگا دیا، حفیظ جالندھری نے بڑی اچھی تصویر کشی کی ہے:

بڑھے انبوہ در انبوہ لے کر دیوانے
لگے باران سنگ اس رحمت عالم پر برسانے

آہ! جو آگ میں پھاندنے والوں کی کمریں پکڑ پکڑ کر گھسیٹ رہا تھا، طائف میں اسی کو کمر کے بل گرایا جا رہا تھا، پتھر مار مار کر گرایا جا رہا تھا، گھٹنے چور ہو گئے تھے، پنڈلیاں لہولہان ہوگئی تھیں، کپڑے سرخ ہو گئے، معصوم خون سے سرخ ہو گئے، پائے مبارک خون سے بھر گئے، جوتیاں خون سے لت پت ہوگئیں، چلنا دوبھر ہو گیا، نوعمر رفیق زید بن حارثہ بے ہوشی کے عالم میں جس طرح بن پڑا ایک گڑھے کے پاس لے آئے، جوتیاں نکالنی چاہیں تو خون اس طرح جم گیا تھا کہ ان کا نکالنا دشوار تھا، تفصیل کہاں تک بیان کی جائے۔ مختصر یہ کہ طائف میں جو کچھ ہوا وہ کبھی نہ ہوا تھا۔

"كان أشد ما لقيت فيهم يوم العقبة إذ عرضت نفسي على ابن عبد ياليل"۔ اس اذیت کی ترجمانی سے زبان وادب قاصر اور اس کے ادراک سے ہمارے شعور عاجز ہیں،

چنانچہ اس موقع پر آپ ﷺ کی زبان مبارک سے بے ساختہ جو دعا نکلی اس کا لفظ لفظ انتہائی سوز و گداز میں ڈوبا ہوا ہے، اور اس کی سطر سطر درد و کسک کے ٹیس سے پر ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بارگاہ ایزدی میں عرض کیا:

"اللَّهُمَّ إِلَيْكَ أَشْكُو ضَعْفَ قُوَّتِي، وَقِلَّةَ

حِيلَتِي، وَهَوَانِي عَلَى النَّاسِ، يَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِينَ، أَنْتَ رَبُّ الْمُسْتَضْعَفِينَ، وَأَنْتَ رَبِّي، إِلَى مَنْ تَكِلُنِي؟ إِلَى بَعِيدٍ يتجهمني؟ أَمْ إِلَى عَدُوٍّ مَلَّكْتَهُ أَمْرِي؟ إِنْ لَمْ يَكُنْ بِكَ عليَّ غَضَبٌ فَلَا أُبَالِي، وَلَكِنَّ عَافِيَتَكَ هِيَ أَوْسَعُ لِي، أَعُوذُ بِنُورِ وَجْهِكَ الَّذِي أَشْرَقَتْ لَهُ الظلماتُ، وَصَلَحَ عَلَيْهِ أمرُ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ مِنْ أَنْ تُنزل بِي غَضَبَكَ، أَوْ يَحِلَّ عليَّ سُخْطُكَ، لَكَ العتبى حَتَّى ترضى، وَلَا حولَ وَلَا قوةَ إِلَّا بالله"۔

میرے اللہ! میں تیرے پاس اپنی بے زوری کا شکوہ کرتا ہوں، تیرے آگے اپنے وسائل و ذرائع کی کمی کا گلہ کرتا ہوں، دیکھ میں انسانوں میں ہلکا کیا گیا ہوں، لوگوں میں یہ میری کیسی سبکی ہو رہی ہے، اے سارے مہربانوں میں سب سے مہربان مالک میری سن! میرا زور، میرا رب تو ہی ہے، مجھے تو کن کے سپرد کرتا ہے، جو ہم سے دور ہوتے ہیں مجھے ان کے نزدیک کرتا ہے، یا تو نے مجھ کو، میرے سارے معاملات کو دشمنوں کے قابو میں دے دیا ہے؟ پھر بھی اگر مجھ پر تیرا غضب نہیں ہے تو مجھے ان باتوں کی کیا پرواہ، مگر کچھ بھی ہو میری سمائی تیری عافیت ہی کے دامن میں ہے، تیرے چہرہ کی وہ جگمگاہٹ جس سے اندھیریاں روشنی بن جاتی ہیں، میں اسی نور کی پناہ میں آتا ہوں کہ اس سے دنیا و آخرت کا سدھار ہے، مجھ پر تیرا غصہ بھڑکے اس سے پناہ مانگتا ہوں، مجھ پر تیرا غضب ٹوٹے اس سے تیرے سایہ میں آتا ہوں، منانا ہے اس وقت تک جب تک تو راضی نہ ہو، نہ قابو ہے نہ زور ہے، مگر اعلیٰ و عظیم اللہ ہی ہے۔

سوز و گداز میں ڈوبی ہوئی یہ فریاد جس نے پتھروں کو بھی پگھلا دیا، زمین و زماں کو رلا دیا، اس نے اللہ تعالیٰ کے غضب کو بھی بھڑکا دیا، چنانچہ جبرئیل امین حاضر ہوئے اور عرض کیا: "قد بعث إليك ملك الجبال"، اللہ نے پہاڑوں کو نہیں، پہاڑوں کے فرشتوں کو بھیجا ہے جو حکم دیں وہ بجا لائے گا، خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: پہاڑ کے فرشتے نے مجھے سلام عرض کیا اور کہا: "یا محمد ذلك لك"، آپ کو اختیار ہے، کس بات کا اختیار ہے، پتھروں کے مارنے والوں کا جواب پہاڑوں سے دینے کا اختیار ہے، لیکن اس رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا اینٹ کا جواب پتھر سے دیا؟

تاریخ شاہد ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: اگر یہ ایمان نہیں لاتے تو امید ہے کہ ان کی نسلوں میں ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو خدائے واحد کے پرستار ہوں گے، شاعر کی زبان میں:

ان کے حق میں کیوں قہر الٰہی کی دعا مانگوں
بشر ہیں بے خبر ہیں کیوں تباہی کی دعا مانگوں

نبی امی ﷺ کے عفو و درگزر اور دشمنوں کو قدرت کے بعد معاف کر دینے کا یہ ایسا نمونہ ہے جس کی مثال تاریخ انسانی پیش کرنے سے قاصر ہے، یہی وہ شخصیت ہے جس کو آج کی مہذب کہی جانے والی دنیا متشدد کہتی ہے، یہی وہ ذات ستودہ صفات ہے جس کو دور حاضر کے تعلیم یافتہ کہے جانے والے انتہا پسند کہتے ہیں، یہی وہ ذات بابرکت ہے جس کو حقوق انسانی کے علمبردار کچھ اور نام دینا چاہتے ہیں، اس کی تعلیمات کو انسانیت کے لیے خطرہ اور امن و امان غارت کرنے کا ذریعہ بتاتے ہیں۔

ذرا انصاف کیجیے! جو پتھروں کے جواب میں پہاڑوں پر قادر ہو پھر بھی عفو و درگزر سے کام لے، جو اپنے جانی دشمنوں کے سر قلم کرنے پر قادر ہو پھر بھی امان کا پروانہ سنائے، اس کو صلح و آشتی کا پیامبر نہ کہیں تو کیا کہیں؟ اس کی تعلیمات کو امن و امان کی تعلیمات نہ کہیں تو آخر کیا کہیں؟

اگر حقائق کو مسخ کرنے، سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ باور کرانے کا نام تہذیب و ثقافت اور تعلیم و ترقی ہے تو یہ تعلیم و ترقی انہیں کو مبارک ہو، دنیا اس سے کوسوں دور رہنا چاہتی ہے، اگر اس کے پاس گوش شنوا اور دل ہوشمند ہے تو وہ اسی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو، اسی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کو اپنا آئیڈیل اور نمونہ بنائے گی جس نے پتھر مارنے والوں کو دعائیں دیں، جس نے کانٹے بچھانے والوں پر پھول نچھاور کیے، جس نے اپنے جانی دشمنوں کو "لاتثريب عليكم اليوم" کا مژدہ جانفزا سنایا، جس نے انسان تو انسان جانوروں تک کے ساتھ رحمت و شفقت کا درس دیا، انسانوں کو انسانیت کا سبق سکھایا، جس نے طاقت و قوت کا صحیح استعمال بتایا، جس نے عدل و انصاف، جود و سخا، ایثار و قربانی، تواضع و انکساری، صدق و سچائی، راست بازی و راست گفتاری، عفو و درگزر، حلم و بردباری، حسن معاشرت و حسن معاملات جیسے شیریں الفاظ اور ان کے صحیح معانی سے روشناس کرایا، ورنہ دنیا ان الفاظ سے نا آشنا اور ان کے مفاہیم سے آج نابلد ہوتی۔

وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا

☆☆☆

اصلاحِ حال

غیرت وحمیت کا فقدان

مولانا محمد شعیب ندوی (جامعہ امداد العلوم سرولی، پرتاپ گڑھ، یوپی)

اسلام کی تاریخ میں اسلامی و ایمانی غیرت و حمیت کے واقعات اتنے ہیں کہ ان کا شمار کرنا مشکل ہے، اسلامی تاریخ کا کوئی دور ایسے باغیرت وباحمیت اصحابِ عزیمت سے خالی نہیں رہا جنہوں نے دین وشریعت میں ذرہ برابر تبدیلی برداشت کی ہو، جب بھی اسلام پر کوئی حملہ ہوا اور مسلمانوں کے ایمان وعقیدہ میں انحراف کی آہٹ محسوس ہوئی، شریعت کے کسی جزء میں معمولی ردوبدل کی آواز اٹھی، مقدسات اسلام کی توہین کا معاملہ سامنے آیا تو علماء حق اس کی بیخ کنی کے لیے فوراً میدان میں آگئے اور جب تک اس فتنہ کا خاتمہ نہیں کر دیا سکون کی سانس نہیں لی۔ اس سلسلہ میں ہمارے سامنے سب سے بڑا نمونہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد مانعین زکوۃ نے زکوۃ دینے سے انکار کر دیا تو ان کی غیرتِ صدیقی جوش میں آئی اور اس فتنہ کو ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اس غیرت کے نتیجہ میں ان کی زبانِ مبارک سے نکلا ہوا تاریخ ساز جملہ نے حالات کا دھارا بدل دیا۔ وہ جملہ تھا: "أينقص الدين وأنا حي" کہ کیا میرے جیتے جی دین کے اندر کوئی کمی آسکتی ہے۔ اس جملہ میں جو جوش وولولہ، آہنی عزم وہمت پنہاں ہے اس کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اسی غیرت مندانہ فیصلہ واقدام نے منع زکوۃ کے فتنہ کو قیامت تک کے لیے ختم کر دیا۔

حضرت عمرؓ اور دیگر صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی زندگیوں میں ایمانی غیرت وحمیت کے بے شمار واقعات ملتے ہیں اور ایسا کیوں نہ ہو کہ اس گلشنِ اسلام کو انہوں نے اپنے خونِ جگر سے سینچا تھا۔ اس گلشن کے ایک ایک پھول اور ایک ایک پتی کی حفاظت اپنی جانوں سے بڑھ کر کرتے تھے۔ گلشن اسلام کی کوئی پتی اور کوئی پھول مرجھا جائے یہ ان کو برداشت نہ تھا، لیکن اس کے بعد کے ادوار میں بھی ایمانی غیرت وحمیت کے حاملین کی مقدس جماعت ہر دور میں موجود رہی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پیشین گوئی حرف بہ حرف پوری ہوتی رہی:

"يحمل هذا العلم من كل خلف عدوله ينفون عنه تحريف الغالين وانتحال المبطلين وتأويل الجاهلين"۔

یعنی اس علم کے حامل ہر دور میں ایسے معتبر لوگ ہوں گے جو اس سے غلو کرنے والوں کی تحریف، باطل پرستوں کی گھڑی ہوئی باتیں، اور جاہلوں کی غلط تاویلات کو دور کرتے رہیں گے۔

چنانچہ غیرت وحمیت کے انہی حاملین میں سب سے بلند نمونہ امام احمد بن حنبلؒ کا سامنے آتا ہے جن کے زمانہ میں خلقِ قرآن کا فتنہ پیش آیا، جہاں ان کا مقابلہ بادشاہِ وقت سے تھا اور میدان میں تن تنہا امام احمد بن حنبل تھے۔ تمام علماء یا تو خلیفہ ہارون الرشید کے ہم خیال ہو گئے تھے یا عزیمت کے بجائے رخصت کا راستہ اختیار کر لیا تھا، لیکن اس مردِ غیور ومردِ آہن نے سخت ترین سزائیں برداشت کیں، اٹھائیس مہینے قید میں رہے اور ان کو تینتیس چونتیس ایسے کوڑے لگائے گئے کہ اگر ایک کوڑا ہاتھی پر لگتا تو چیخ مار کر بھاگتا، لیکن اپنے موقف سے دستبردار ہونا گوارہ نہ کیا۔ ان کی اس غیرت مندانہ جرأت کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ فتنہ صرف تاریخ کے صفحات کی زینت بن کے رہ گیا اور ہمیشہ کے لیے اس کا خاتمہ ہو گیا۔ چنانچہ ان کے ایک ہم عصر مشہور محدث اور امام بخاریؒ کے استاذ علی بن المدینیؒ نے گواہی دی:

"إن الله أعز هذا الدين برجلين ليس لهما ثالث، أبو بكر ﷺ يوم الردة وأحمد بن حنبل يوم المحنة"۔

ترجمہ:- اللہ نے اس دین کے غلبہ وحفاظت کا کام دو شخصوں سے لیا جن کا کوئی تیسرا ہمسر نظر نہیں آتا، ارتداد کے موقع پر حضرت ابوبکر صدیقؓ اور خلق قرآن کے سلسلہ میں امام احمد بن حنبلؒ۔

اسی غیرت وحمیت کا ایک بے مثال نمونہ معتصم باللہ کا ہے کہ جب عیسائیوں کے ایک شہر عموریہ میں ایک خاتونِ اسلام پر ظلم ہوا اور ایک عیسائی نے اس کو تھپڑ مارا تو اس کی زبان سے یہ صدا نکلی: "وامعتصماه"! ظلم وستم کی ماری اس خاتونِ اسلام کی اس پر درد صدا وفریاد کا معتصم کے کان میں پڑنا تھا کہ اس کی رگِ حمیت پھڑک اٹھی، لبیک کہتے ہوئے فوج ولشکر کو اس خاتون کو ظلم کے شکنجہ سے نکالنے کا فوراً فرمان جاری کیا اور اس شہر کو فتح کر کے ہی اطمینان کی سانس لی۔

خود ہندوستان پر محمد بن قاسم ثقفی کے حملہ کا سبب کیا تھا؟ راجہ داہر کے زیرِ حکومت کچھ ظالموں نے مسلمان عورتوں کو قید کر لیا، حجاج کو خبر پہنچی، پھر کیا تھا غیرتِ اسلامی جوش میں آئی، اس نے پہلے عبید اللہ بن نبہان کو حملہ کے لیے بھیجا، بالآخر وہ

کام آئے اور مقصد حاصل نہ ہوسکا، پھر بدیل بن طہفہ کو بھیجا لیکن ان کا انجام بھی وہی ہوا، پھر محمد بن قاسم ثقفی کو حملہ کے لیے روانہ کیا۔ چنانچہ اس جوانمرد نے سندھ کو فتح کر کے اسلام کا جھنڈا لہرایا اور مسلمان عورتوں کو آزادی دلائی۔

ہماری تاریخ غیرت وحمیت کے ایسے واقعات سے بھری ہوئی ہے، بلکہ اسلام کی نشر واشاعت، اسلامی مملکت کی توسیع کا راز اسی غیرت وحمیت میں پنہاں ہے جو ہمارا سب سے بڑا سرمایہ تھا۔

اکبر کے دور میں دین الٰہی کا فتنہ کتنا خطرناک تھا، لیکن حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی فاروقی غیرت وحمیت نے پورے ملک کا نقشہ بدل کر رکھ دیا اور ہند میں سرمایۂ ملت کی نگہبانی وپاسبانی کا تاریخی کارنامہ سرانجام دیا:

وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہبان
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار
گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
جس کے نفسِ گرم سے ہے گرمیٔ احرار

حقیقت یہ ہے کہ برصغیر ہندوپاک میں امیر المؤمنین حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کی تحریکِ جہاد، اس کے بعد اسلام کی بقا وتحفظ کے لیے مدارسِ اسلامیہ کا قیام، یہ سب ہمارے اسلاف کی غیرتِ ایمانی واسلامی کا نتیجہ ہے۔

عہدِ قریب میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اس غیرتِ صدیقی اور حمیت فاروقی کے جذبہ سے سرشار مجددِ دوراں تھے جنہوں نے اگر ایک طرف عالم عربی میں قومیتِ عربیہ کے فتنہ کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور شاہانِ عرب کے ایوانوں میں کلمۂ حق بلند کیا اور **"کلمة حق عند سلطان جائر"** کا فریضہ انجام دیا تو دوسری طرف اپنے وطن میں اٹھنے والے بے شمار فتنوں کے لیے سینہ سپر ہو گئے اور حالات کے دھارے کو بدل دیا۔

آج بھی مسلمانوں کے سامنے کتنے سنگین حالات ہیں، کیسے خطرناک فتنے ہیں، ارتداد کا فتنہ ہے، الحاد ولادینیت کا فتنہ ہے، شرکیہ نظامِ تعلیم کا فتنہ ہے، بے حیائی وآوارہ باخنگی کا فتنہ ہے، نوجوانوں میں شراب نوشی اور نشہ آور چیزوں کی عادتوں کا روز بروز فروغ ہورہا ہے، بہن بیٹیوں کو سرعام اغوا کر کے اور شیطانی جال میں پھنسا کر صرف ان کی عزت وآبرو ہی نہیں بلکہ ان کے دین وایمان پر کھلے عام ڈاکہ ڈالا جارہا ہے۔ کیا یہ ایمان سوز وحیا سوز فتنے ہماری غیرتِ ایمانی میں جنبش پیدا کرنے کے لیے کافی نہیں ہیں؟

حقیقت یہ ہے کہ ہماری غیرت مرچکی ہے، جس پر کبھی مصلحت پسندی کا لبادہ ڈال دیا جاتا ہے، کبھی حالات کی ناسازگاری کا بہانہ تراشا جاتا ہے، کبھی ذاتی منفعت، عیش پرستی وآرام طلبی ہمتوں کو پست کر دیتی ہے۔ غیرت وحمیت کا یہ فقدان امت اسلامیہ کا سب سے بڑا المیہ ہے۔

حالانکہ یہی غیرت وحمیت ہماری پہچان تھی جو ناممکن کو ممکن بنا دیتی تھی، اندھیروں کو اجالوں میں بدل دیتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ غیرت جب کسی فرد یا قوم میں بیدار ہوجاتی ہے تو وہ خطرات اور آزمائشوں کو خاطر میں نہیں لاتی، وہ وقت کے فرعونوں اور طاغوتوں سے نہیں ڈرتی، دریا وپہاڑ بھی اس کا راستہ نہیں روک پاتے، مردِ حق ومردِ غیور جیل کی سلاخوں سے نہیں گھبراتا، وہ تو اپنی جان کا نذرانہ بھی اپنے رب کے حضور یہ کہتے ہوئے پیش کر دیتا ہے:

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

ہم وہ زندہ قوم ہیں جس نے کبھی اپنے ایمان وعقیدہ کا سودا نہیں کیا، اپنی بہن بیٹیوں کے ساتھ ذرہ برابر کھلواڑ برداشت نہیں کی، اپنے نبی کی شان میں گستاخی گوارہ نہیں کی، دینی شعائر اور ملی خصوصیات کے ساتھ کوئی سمجھوتہ نہیں کیا۔

سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کے بارے میں آتا ہے کہ ''میدانِ جنگ میں سلطان کی کیفیت ایک ایسی غمزدہ ماں کی سی ہوتی تھی جس نے اپنے اکلوتے بچے کا داغ اٹھایا ہے، وہ ایک صف سے دوسری صف تک گھوڑے پر دوڑتے پھرتے اور لوگوں کو جہاد کی ترغیب دیتے اور پکارتے پھرتے: **یا للاسلام!** اسلام کی مدد کرو! آنکھوں سے آنسو جاری ہوتے''۔

سلطان ہی کا واقعہ ہے کہ ریجنالڈ جس نے دھوکہ سے حاجیوں کے قافلہ پر حملہ کیا تھا، جب ان بے کس حجاج نے اس سے انسانیت وشرافت کی درخواست کی تو اس نے گستاخانہ کہا کہ ''اپنے محمد سے کہو کہ تمہیں رہائی دیں''۔ یہ فقرہ سلطان صلاح الدین کو پہنچا اور اس نے منت مانی کہ اگر یہ بے ادب اس کے ہاتھ آئے گا تو اپنے ہاتھ سے اس کو قتل کروں گا۔ چنانچہ جب فتح حاصل ہوگئی تو سلطان نے اس کو طلب کیا اور کہا: **"ها أنا أنتصر اليوم لمحمد عليه الصلاة والسلام"** (لو میں آج محمد ﷺ کا انتقام لیتا ہوں) اور گردن اڑادی)۔

سلطان کی یہی وہ بے چینی وبے کلی تھی جس نے مسجد اقصیٰ کی بازیافت کے لیے ان کو مجبور کر دیا تھا۔

آج امت کو ایسے ہی غیرتمند سپوتوں کی ضرورت ہے جو ہر فتنہ کی سرکوبی کے لیے سینہ سپر ہو جائیں اور تن من دھن کی بازی لگادیں اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کا تاریخ ساز جملہ **"أينقص الدين وأنا حي"** کو اپنی زندگی کا نصب العین بنالیں۔

☆☆☆

توکل وقناعت

حقیقی خوشی کا راستہ

مولانا محمد سمعان خلیفہ ندوی (استاذ جامعہ اسلامیہ۔ بھٹکل)

اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی پر جو دین اتارا ہے وہی تنہا راستہ ہے، جس پر چلنے والا کبھی بدبختی کا شکار نہیں ہوتا، اس کے علاوہ جتنے راستے ہیں یہ وہ پگڈنڈیاں ہیں جن سے منزل ہاتھ نہیں آتی، اسلام ہی راہِ نجات ہے، طریقِ سعادت ہے، کامیابی کی شاہ کلید ہے، دنیا و آخرت کی سچی خوشیوں کا ذریعہ ہے۔ اطاعت، ایمان اور تقویٰ کا راستہ ہی وہ راستہ ہے کہ جس پر ہم چل پڑیں تو دل سکون سے مالا مال ہو جائیں، چاہے دنیا کتنی ہی بے چین کیوں نہ ہو۔ یہ مال سے حاصل ہونے والی یا لذتوں سے ہاتھ آنے والی سوغات نہیں ہے، بلکہ سچے رجوع الی اللہ، خالص نیت اور کامل توکل کی روشنی سے منور ہونے والی ڈگر ہے۔

ایک سوال ہم میں اکثر لوگوں کے دلوں کو جھنجھوڑتا ہے: ہم میں سے کون ہے جو خوشی کی تلاش میں نہیں؟ کون ہے جو یہ نہیں چاہتا کہ اس کا دل مسرور ہو، اس کی روح سکون سے معمور اور اس کا باطن مطمئن ہو؟ مگر اصل سوال یہ ہے کہ یہ سچی خوشی کہاں ملتی ہے؟ اور کون سا راستہ ہمیں اس تک پہنچاتا ہے؟

بہت سے لوگوں نے اسے مال میں تلاش کیا، اس کے پیچھے دوڑتے رہے، مگر حاصل صرف تھکن ہوئی۔ کچھ نے اسے شہرت اور اقتدار میں سمجھا، مگر ان کے دل کو خوف اور بے چینی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا۔ وہ یہ بھول گئے کہ حقیقی خوشی اس ظاہری ساز و سامان میں نہیں جو ہمارے پاس ہے، بلکہ اس حقیقی دولت میں ہے جس سے ایمان والوں کے دل بہرہ مند ہوتے ہیں: ایمان، یقین، عمل کی پاکیزگی، کردار کی طہارت اور اللہ کا قرب۔

جس شخص کا سینہ دنیا کی فکروں سے اُوب چکا ہے اور جو سراب کے پیچھے دوڑتے دوڑتے تھک ہار چکا ہے! اسے اچھی طرح معلوم ہونا چاہیے کہ دین اسلام ہی وہ واحد راستہ ہے جس پر چلنے والا کبھی بدبخت نہیں ہوتا۔ اس میں سکون ہے، رضا ہے، اطمینان ہے۔ دل کی خوشیاں ہیں، روح کی لذتیں ہیں، اس میں اللہ کی طرف سے ودیعت کیا گیا نور ہے، خوف سے امان ہے اور دنیا و آخرت کی بشارتیں ہیں۔ بلکہ سچی بات تو یہ کہ اسی میں دل کی زندگی ہے۔

ایک غریب محلے میں ایک نوجوان رہتا تھا جسے خالق کی معرفت حاصل تھی۔ وہ جوتے سیتا تھا۔ اس کا لباس سادہ، مال کم، مگر اسے ہمیشہ مسکراتے ہوئے دیکھا جاتا۔ اس کی زبان پر اکثر یہ ہوتا تھا: ''اے اللہ! تیرا بھرپور شکر ہے جیسا تیرے جلال کے شایانِ شان ہے۔'' ایک دن کسی نے اس سے پوچھا: ''کیا تم بہتر زندگی کی خواہش نہیں رکھتے؟'' اس نے نہایت سکون سے جواب دیا: ''میں تو بہترین زندگی گزار ہی رہا ہوں جب تک میں ہر صبح اٹھ کر اپنے دل کو اللہ کی محبت سے بھرا ہوا پاتا رہوں، نہ فقر مجھے پریشان کرتا ہے اور نہ لوگ مجھے اہم لگتے ہیں۔ میں اللہ کی تقسیم پر راضی ہو چکا ہوں، اسی لیے خوشیوں سے میرا دامن آباد ہے۔'' ایک دن وہ دنیا چھوڑ چلا، مگر اس کی مسکراہٹ محلے والوں کی یادوں کا حصہ بن کر رہ گئی، اور اس کے الفاظ برابر انہیں یاد دلاتے رہے کہ خوشی کا راستہ اندر سے شروع ہوتا ہے' اس دل سے جو اللہ سے جڑا ہو۔ واقعی یہی وہ راستہ ہے جس پر چلنے والا بدبخت نہیں ہوتا۔

ہر مسکراتا انسان خوش نہیں ہوتا، ہاں جو اللہ کی تقسیم پر راضی ہو گیا اور قناعت کرنا جسے آ گیا وہ ضرور خوش ہو جاتا ہے۔ ہاتھوں میں موجود چیزوں سے خوشی ناپی نہیں جاتی بلکہ دل کے حال سے ناپی جاتی ہے۔ وہ دل جو اللہ پر بھروسہ کرتا ہے، ہر حال میں اسی سے امید رکھتا ہے اور ہر فیصلے پر راضی رہتا ہے، درحقیقت اسی نے وہ راستہ پا لیا ہے جس پر چلنے والا کبھی بدبخت نہیں ہوتا۔

دنیا فانی ہے۔ سچی خوشی بنگلوں اور مال و دولت کے انبار میں نہیں، بلکہ دلوں میں موجود ایمان اور تقویٰ میں ہے، اللہ کی اطاعت اور اس کے قرب میں ہے۔ لہٰذا ہم سب کو چاہیے کہ رضا اور اطمینان کے اس راستے کی تلاش کریں اور اپنے دلوں کو اللہ کے ذکر سے زندہ کریں، اگر ہم اس کی پسند کے مطابق زندگی نہ گزاریں تو ہماری زندگی بے معنی ہو جائے گی اور دنیا کی آزمائشیں اور مصیبتیں ہمیں ہلاک کر دیں گی۔

آیئے! ہم اپنے نفس کا جائزہ لیں اور اپنے دلوں کو دیکھیں: کیا ان میں نیکی ہے؟ کیا ان میں خشیتِ الٰہی ہے؟ کیا ان میں اللہ کی محبت ہے؟ کیا ہم کبھی اس کے سامنے کھڑے ہوئے، اپنے کیے پر نادم ہوئے، اس کے سامنے کبھی آنسو بہائے اور عاجزی اختیار کی؟----

(باقی صفحہ ۲۵ پر)

محاسن اسلام

مرد کی قوامیت کا مفہوم

مولانا منور سلطان ندوی (رفیق مجلس تحقیقات شرعیہ، ندوۃ العلماء)

مغربی فیمنسٹ مفکرین اسلام کے خاندانی نظام پر جو اعتراضات کرتے ہیں ان میں ایک بڑا اعتراض یہ ہے کہ اسلام میں عورت کو مرد کے تابع بنایا گیا ہے، عورت محکوم ہے، اور مرد حاکم، مسلم معاشرہ میں مرد کا غلبہ ہوتا ہے، اور عورت اپنے شوہر کی مرضی پر منحصر اور ان کی دست نگر ہوتی ہے، شوہر کو بیوی پر حاکمانہ اختیارات حاصل ہوتے ہیں، اور عورت کو شوہر کی مرضی کے خلاف چوں کرنے کی بھی اجازت نہیں ہوتی، ان مفکرین کے نزدیک مرد کی قوامیت کا تصور صنفی مساوات (Gender Equality) کے سراسر خلاف ہے۔

ہیومن رائٹس کے اداروں کی طرف سے بھی صنفی مساوات کی صدائیں بلند ہوتی رہتی ہیں، اس حوالے سے وہ بھی اسلام کے عائلی نظام پر تنقید کرتے رہتے ہیں، مسلم فیمنسٹ مفکرین اور مصنفین کو بھی مردوں کے غلبہ والا معاشرہ پسند نہیں ہے، ان سب کے علاوہ خود مسلم سماج کے ناقدین کا بھی عموماً تصور یہی ہوتا ہے کہ مسلم معاشرہ میں عورت پر ظلم ہوتا ہے، اور مرد قوامیت کا غلط استعمال کرتے ہیں۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ مختلف فکری حلقوں کے افراد اس مسئلہ پر چیں بجبیں ہوتے ہیں، ان کے اعتراضات کی جہتیں الگ الگ ہیں، مگر سبھوں کا مقصود ایک ہے، قوامیت کے مسئلہ پر اسلامی تعلیمات کو نشانہ بنانا، اس مسئلہ کو علمی انداز سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ قوامیت کا اصل مفہوم کیا ہے؟ مضبوط سماج کے لئے مرد و عورت میں کسی ایک کی سربراہی کی ضرورت ہے یا دونوں کو یکساں درجہ ملنا چاہئے؟

قرآن کریم میں اسلامی عائلی نظام کے مختلف گوشوں کو جگہ جگہ واضح کیا گیا ہے، عموماً عام معاملات میں مرد و عورت دونوں کو یکساں حیثیت کا حامل قرار دیا گیا ہے، متعدد آیات میں اس کی تفصیلات آتی ہیں (تفصیل کے لئے تعمیر حیات کے ۲۵ جنوری کے شمارہ میں راقم کا مضمون ملاحظہ کریں) لیکن اسی کے ساتھ مرد کو عورت پر برتری بھی دی گئی ہے، قرآن میں واضح انداز میں کہا گیا:

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ (بقرہ:۲۲۸) ترجمہ:- اور جیسے عورتوں پر مردوں کے حقوق ہیں ایسے ہی مردوں پر عورتوں کے بھی حقوق ہیں، ہاں البتہ مردوں کو عورتوں پر یک گونہ فضیلت حاصل ہے۔ الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللَّهُ بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ وَبِمَا أَنْفَقُوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ (نساء:۳۴)

ترجمہ:- مرد عورتوں پر نگراں ہیں، اس لئے کہ اللہ ہی نے بعض کو بعض پر فضیلت عطا فرمائی ہے، اور اس لئے بھی کہ مرد اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔

قوام کا مفہوم

بعض اردو تفاسیر میں قوام کی تشریح حاکم، افسر، سربراہ، یا سرپرست کے الفاظ سے کی گئی ہے، لغت کے لحاظ سے یہ مفہوم بھی درست ہے، لیکن عموماً ایک لفظ کے کئی معانی ہوتے ہیں، سیاق وسباق اور صلہ کے ذریعہ معنی میں تبدیلی کی جاتی ہے، قوام کا لفظ قام سے بنا ہے، اور قام کا ایک معنی نگرانی وخبر گیری کے بھی ہیں، لسان العرب میں ہے: ''عورت کا ''قیِّم'' اس کا شوہر ہوتا ہے، کیونکہ وہ اس کے معاملات کو سنبھالتا ہے اور اس کی ضروریات پوری کرتا ہے۔ اور کہا جاتا ہے: قام بامر کذا یعنی اس کی ذمہ داری اٹھائی۔ اسی طرح: قَامَ الرجلُ عَلَى المرأَةِ یعنی وہ اس کا نگران اور کفیل ہے۔ اور کہا جاتا ہے: وَإِنَّهُ لَقَوّام عَلَيْهَا یعنی وہ اس کی کفالت کرنے والا اور اس کے اخراجات اٹھانے والا ہے۔ اور قرآنِ کریم میں ہے: الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ، یہاں ''قِیام'' سے مراد وہ کھڑا ہونا نہیں ہے جو بیٹھنے کے مقابلے میں ہوتا ہے، بلکہ یہ قُمْتُ بأَمرك' کے معنی میں ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ مرد عورتوں کے معاملات کے ذمہ دار، ان کے کفیل، اور ان کے کاموں کی دیکھ بھال کرنے والے ہیں۔''

(لسان العرب، ج ۱۲، ص: ۵۰۲)

ابوحیان اندلسی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ قوام مبالغہ کا صیغہ ہے، اس کے معنی ہیں خوب اچھی طرح نگرانی کرنے والا اور حفاظت کرنے والا۔

(البحر المحیط فی التفسیر ج ۳، ص: ۶۲۳)

علامہ رازی نے بھی یہی بات لکھی ہے، وہ فرماتے ہیں: ''قِوام'' اُس شخص کو کہا جاتا ہے جو کسی کام کی انجام دہی میں بہت زیادہ اہتمام اور مبالغہ کرے۔ کہا جاتا ہے: ''هذَا قَيِّمُ الْمَرْأَةِ وَ قِوَامُهَا''، یعنی وہ شخص جو اس کے معاملات کو سنبھالتا ہے اور اس کی حفاظت ونگہداشت کا خیال رکھتا ہے۔ (مفاتیح الغیب، ج ۱۰، ص: ۷۰)

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ تحریر فرماتے ہیں:

''قوام کے معنی ہیں کسی شئی کے محافظ، منتظم، مدبر کے، یہاں مراد عورتوں کے امور کا انتظام کرنے والے، ان کی کفالت کرنے والے ان پر احکام نافذ کرنے والے ہیں۔ (تفسیر ماجدی، ص:۲۲۴)

قوام: مفسرین کی آراء

مفسرین نے قوام کی تفسیر میں اسلام کے خاندانی نظام پر تفصیلی گفتگو کی ہے:

علامہ رازی لکھتے ہیں: انھیں عورتوں کو ادب سکھانے اور کوتاہی کی صورت میں ان کی گرفت کرنے کی ذمہ داری دی گئی ہے۔

(مفاتیح الغیب، ج ۱۰، ص: ۷۰)

گویا اللہ تعالیٰ نے مرد کو عورت پر حکمران بنایا ہے، اس پر (یعنی عورت پر) اس کا (یعنی مرد کا) حکم چلتا ہے۔

علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں: ''عورت پر مرد کے قیّم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس کا سردار، اس کا بڑا، اس پر حکمران اور کجی کی صورت میں اسے ادب سکھانے والا ہے۔'' (تفسیر ابن کثیر، ج۲، ص:۲۹۲)

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب اس قوام کی تشریح میں تحریر فرماتے ہیں: اس آیت میں قانون معاشرت کا ایک بنیادی اصول بتایا گیا، کہ خاندانی نظام کی اساس اس امر پر ہوگی کہ مرد صدر خاندان ہوگا، اسی حیثیت سے اس کی ذمہ داریاں بھی ہوں گی، اور اس کے اختیارات بھی ہوں گے، بظاہر اس میں مرد کا اعزاز ہے، لیکن درحقیقت یہ مرد کی ذمہ داریوں کا تذکرہ ہے، خاندان کی حفاظت، ان کی نگہ داشت، اس کی تعلیم و تربیت اور اس کی ضروریات کی کفالت گویا ساری ذمہ داریاں مرد کے سر ہوں گی۔ (آسان تفسیر، سورہ نساء: ۳۴)

مرد کو عورت پر قوام کیوں بنایا گیا؟

مرد کو عورت کی ذمہ داری کیوں سپرد کی گئی؟ اس بارے میں قرآن کریم میں متعدد آیات میں واضح اشارات موجود ہیں، سورہ نساء کی آیت جو اوپر گزر چکی ہے، اس میں دو اسباب کا ذکر کیا گیا ہے، مفسرین پہلی وجہ کو وہبی اور دوسری وجہ کسبی قرار دیتے ہیں:

پہلی وجہ: بعض پہلوؤں سے مرد کی عورت پر فوقیت و برتری، مفسرین نے اس کی تفصیلات بیان کی ہیں: امام رازیؒ فرماتے ہیں: ''عورتوں پر مردوں کو بہت سی وجوہ سے فضیلت حاصل ہے۔ ان میں سے بعض حقیقی اوصاف ہیں اور بعض شرعی احکام۔ جہاں تک حقیقی اوصاف کا تعلق ہے تو ان کی بنیاد دو چیزوں پر ہے: علم اور قدرت۔ اس میں شک نہیں کہ مردوں کی عقل اور ان کا علم بڑھا ہوا ہوتا ہے اور اس میں بھی شک نہیں کہ انھیں پُرمشقت کاموں کو انجام دینے کی بھرپور قدرت حاصل ہوتی ہے۔ انھی دو اسباب سے مردوں کو عورتوں پر عقل، دوراندیشی، قوت، تحقیق و تصنیف، شہ سواری، تیراندازی کے معاملے میں فضیلت حاصل ہے اور یہ کہ ان میں انبیا اور علما ہوئے ہیں، وہ امامت کبریٰ اور امامتِ صغریٰ کے مناصب پر فائز ہوتے ہیں۔ جہاد، اذان، خطبہ، اعتکاف اور حدود و قصاص میں شہادت کے معاملے میں بالاتفاق اور امام شافعی کے نزدیک نکاح کے معاملے میں بھی انھیں فضیلت حاصل ہے۔ میراث میں ان کا حصہ زیادہ ہوتا ہے۔ قتلِ عمد اور قتلِ خطا میں وہ دیت ادا کرتے ہیں۔ نکاح میں انھیں ولایت حاصل ہے۔ طلاق، رجعت اور تعدّد ازدواج کا بھی انھیں حق ہے۔ اولاد ان کی طرف منسوب ہوتی ہے۔ یہ تمام چیزیں عورتوں پر مردوں کی فضیلت پر دلالت کرتی ہیں''۔

(مفاتیح الغیب، ج ۱۰، ص: ۷۱)

علامہ ابن کثیر نے مرد کی برتری کے ضمن میں نبوت، حکمرانی اور قضاء کا ذکر کیا ہے۔

(دیکھئے تفسیر ابن کثیر، ج ۲، ص: ۲۹۲)

علامہ رشید رضا مصری نے اپنے استاذ شیخ محمد عبدہ کے حوالے سے اس بارے میں بڑی عمدہ گفتگو کی ہے، وہ فرماتے ہیں: ''بعض کو بعض پر فضیلت دینے'' سے مراد مردوں کو عورتوں پر فضیلت دینا ہے۔ اگر یوں کہا جاتا: بِمَا فَضَّلَهُمْ عَلَيْهِنَّ (یعنی اللہ نے مردوں کو عورتوں پر فضیلت دی) تو بات زیادہ مختصر اور واضح ہوتی، جیسا کہ ہم نے بیان کیا۔ لیکن اس اندازِ تعبیر میں وہی حکمت ہے جو اس آیت میں ہے: وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ (النساء: ۳۲) اس کی حکمت یہ ہے کہ عورت مرد کے ساتھ اور مرد عورت کے ساتھ ایسے ہے جیسے ایک جسم کے مختلف اعضا۔ پس مرد کی حیثیت سر کی مانند ہے اور عورت کی حیثیت جسم کی مانند ہے (میں کہتا ہوں:) اس کا مطلب یہ ہے کہ: مرد کو اپنی طاقت کی بنا پر عورت پر ظلم یا زیادتی نہیں کرنی چاہیے اور نہ ہی عورت کو مرد کی اس فضیلت کو اپنے لیے توہین یا کمی سمجھنا چاہیے، کیونکہ کسی شخص کے لیے یہ عیب نہیں کہ اس کا سر اس کے ہاتھ سے افضل ہو، یا اس کا دل اس کے معدے سے زیادہ معزز ہو، جسم کے بعض اعضا کا بعض پر برتر ہونا بھی اور بعض کو سربراہ بنانا بھی یہ پورے جسم کی مصلحت کے لیے ہوتا ہے، اور اس میں کسی عضو کا نقصان نہیں ہوتا بلکہ تمام اعضا کا فائدہ اسی میں ہوتا ہے۔

اسی طرح مرد کو عورت پر جو فضیلت دی گئی ہے، وہ قوت یعنی کمانے کی صلاحیت اور حفاظت کرنے کی قدرت کے اعتبار سے ہے اور یہی وہ چیزیں ہیں جن کے ذریعے عورت اپنے فطری کام (حمل، ولادت، بچوں کی پرورش) اطمینان اور تحفظ کے

ساتھ انجام دے سکتی ہے، جبکہ اس کے رزق اور ضروریات کی کفالت کی جارہی ہو، مزید اس تعبیر میں ایک اور حکمت یہ ہے کہ یہ فضیلت ''جنس'' کے اعتبار سے ہے، نہ کہ ہر ہر مرد کو ہر ہر عورت پر برتری حاصل ہے چنانچہ بہت سی عورتیں اپنے شوہروں سے علم میں عمل میں بلکہ جسمانی طاقت اور کمائی کی صلاحیت میں بھی بڑھ کر ہوتی ہیں۔''

(تفسیر المنار، ج۵، ص:۵۶)

دوسری وجہ یہ ہے کہ مرد کے ذمہ عورت کی کفالت ہے، شریعت نے افرادِ خاندانی کی کفالت اور ان کی معاشی وسائل فراہم کرنے کی ذمہ داری مرد پر عائد کی ہے، اور عورت کو اس ذمہ داری سے آزاد رکھا ہے، یہی وصف مرد کو خاندان کی سربراہی کے لائق بناتا ہے۔ وَبِمَا اَنْفَقُوا مِنْ اَمْوَالِهِمْ (النساء:۳۴) اور اس سبب سے کہ مرد اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔ اسی مفہوم کو دوسری جگہ اس طرح بیان کیا گیا: وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ (البقرہ: ۲۳۳) بچے کے باپ کو معروف طریقے سے انھیں کھانا کپڑا دینا ہوگا۔

اس سبب کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ رشید رضا مصری تحریر فرماتے ہیں: ایک اور سبب بھی ہے جو کسبی ہے اور فطری سبب کو مزید مضبوط کرتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ مرد اپنے مال سے عورتوں پر خرچ کرتے ہیں۔ چنانچہ مہر دراصل عورت کے لیے ایک معاوضہ اور اس بات کا اعتراف وصلہ ہے کہ وہ نکاح کے عقد کے ذریعے ایک مشترکہ نظامِ زندگی میں داخل ہوتی ہے، جس میں مرد کو (قوامیت) حاصل ہوتا ہے۔ اس طرح شریعت نے عورت کی تکریم کی ہے کہ اس کے لیے ایک ایسا مالی حق (مہر) مقرر کیا جو ایک ایسے معاملے کے مقابل میں ہے جس کا تقاضا فطرت اور معاشرتی نظامِ زندگی دونوں کرتے ہیں، یعنی یہ کہ اس کا شوہر اس کا نگران اور ذمہ دار ہو۔ مزید یہ کہ شریعت نے اس معاملے کو ان معاشرتی وعرفی امور میں شامل کیا ہے جن پر لوگ باہمی رضامندی سے، عقود کے ذریعے، مصلحت کے پیشِ نظر اتفاق کرتے ہیں گویا عورت اپنی مرضی اور اختیار سے مکمل مساوات کے بجائے ایک ایسا خاندانی نظم قبول کرتی ہے جس میں مرد کو اس پر ایک درجہ حاصل ہوتا ہے، اور وہ درجہ قوامیت اور نظمِ خاندان کی سربراہی کا ہے اور وہ اس کو قبول کرتی ہے۔''

(تفسیر المنار، ج ۵، ص:۵۶)

مرد سربراہِ خاندان ہے نہ کہ حاکم

ان تفصیلات سے واضح ہوتا ہے کہ مرد کو خاندان کا سربراہ یا نگراں بنایا گیا ہے، بیوی اور بچوں کی کفالت کرنا، زندگی کے سرد وگرم مسائل سے تحفظ فراہم کرنا ان کی ذمہ داری ہے، وہیں بیوی کی اپنی مستقل حیثیت ہے، عورت کی حیثیت کا اندازہ درج ذیل مثالوں سے لگایا جاسکتا ہے:

نکاح سے پہلے عورت کو شوہر کے انتخاب کی آزادی دی گئی تھی، تاکہ وہ اپنی مرضی اور پسند سے شریک حیات چن سکے، اس پر کسی کو مسلط نہیں کیا جاسکتا ہے۔

نکاح کے بعد عورت کی اپنی ملکیت ہوگی، وہ جن چیزوں کی مالک ہوگی، اس میں وہ اپنی مرضی سے خرچ کرنے کی مختار ہوگی، وہ شوہر سے پوچھنے اور اجازت لینے پر مجبور نہیں ہوگی۔

عورت کو ملازمت، کاروبار اور دیگر معاشی سرگرمیاں انجام دینے کا اختیار حاصل ہے۔

خلاصہ یہ کہ قوامیت کا مطلب یہ ہے کہ مرد کو خاندان کا سربراہ بنایا گیا، ان کی ذمہ بیوی اور بچوں کی کفالت ونگرانی کرنا اور خاندان کے نظم کو اس اعتبار سے باقی رکھنا کہ سبھوں کی حیثیت باقی رہے، قوامیت کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اسلام میں مرد کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ عورت پر ظلم کرے، دبائے، اور اس کی آزادی کو سلب کرلے، ایسا کرنا اسلامی تعلیمات کے سراسر خلاف ہے۔

☆☆☆

بقیہ: سچی خوشی کا راستہ

یقیناً حقیقی خوشی اسی میں ہے کہ ہم اللہ کی طرف لوٹ آئیں، اس کی رسی کو مضبوطی سے تھام لیں، اس کی اطاعت پر زندگی گزاریں اور اس کی رضا پر موت پائیں۔ جس نے اطاعت کی لذت چکھ لی، اس کے لیے ہر مشقت آسان ہوجاتی ہے۔ اور جو اللہ کے ساتھ جیتا ہے، اس کی روح پرسکون ہوجاتی ہے، اس کا دل مطمئن ہوجاتا ہے اور وہ اپنے حال پر راضی رہتا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَّلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (النحل/۹۷) ترجمہ:- جو کوئی نیک عمل کرے، مرد ہو یا عورت، بشرط یہ کہ وہ مومن ہو، تو ہم اسے ضرور پاکیزہ زندگی عطا کریں گے اور انہیں ان کے بہترین اعمال کے مطابق اجر دیں گے۔

خوشی کوئی وہم نہیں اور نہ ہی کوئی دقت طلب اور مشکل چیز ہے، مگر اسے حاصل کرنے کے لیے سچی طلب اور اپنی بساط بھر اللہ کی اطاعت ضروری ہے۔ نیکی، دعا، قرآن کی تلاوت، ہدایت کے راستے کی پیروی اور تقویٰ یہ سب دل کی خوشی اور اللہ کی رضا کے ذرائع اور اسباب ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی اطاعت والوں میں شامل فرمائے، دنیا وآخرت کی سعادت عطا فرمائے اور ہمیں اپنے قرب کی لذت سے مالا مال کرے، آمین!

☆☆☆

تذکیر وارشاد

حسد کے تباہ کن اثرات

مولانا محمد سلمان بجنوری ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

انسانی جسم کی تخلیق اس طرح ہوئی ہے کہ یہ متاثر ہوتا ہے، اگر آدمی اپنے جسم کو مناسب غذا فراہم نہ کرے اور اپنی صحت کا خیال نہ رکھے تو جسم متاثر ہوتا ہے، بیماریاں اس کو گھیر لیتی ہیں اور پھر یہ کمزور پڑ جاتا ہے، یہاں تک کہ کسی کام کے قابل نہیں رہتا۔ اسی طرح انسانی روح ہے، یہ بھی متاثر ہوتی ہے، اس پر بھی ضعف طاری ہوتا ہے، یہ بھی بیمار ہوتی ہے، لیکن عام طور سے ہم اپنے جسم اور صحت کا تو خیال رکھتے ہیں، اس کی فکر بھی کرتے ہیں، لیکن اپنی روح سے بالکل غافل رہتے ہیں، جس کی پرواہ اور فکر زیادہ ہونی چاہیے، اس سے ہم کلی طور پر اعراض کیے رہتے ہیں، جسم ایک ظاہری ڈھانچہ ہے، جس کو سنوارنے اور آراستہ کرنے کی خاطر ہم کیا کیا جتن نہیں کرتے اور روح جو کہ اصل ہے، جس پر ہمارے جسم کا دارومدار ہے، اگر روح ہے تو جسم چلتا پھرتا رہے گا اور جس دن روح جسم سے پرواز کر گئی، اس دن اس ڈھانچے کی کوئی قیمت رہتی ہے نہ کوئی حیثیت، یہ محض ایک لاشہ ہوتا ہے۔

ہمارے اندر بے شمار اخلاقی وروحانی بیماریاں ہیں، جس کی طرف ہماری کوئی توجہ نہیں اور نہ ہم اس کے علاج کی فکر کرتے ہیں، جسمانی بیماری کے لیے ہم نہ جانے کتنے بڑے بڑے اطباء کا انتخاب کرتے ہیں، لیکن روحانی بیماریوں کے علاج کے لیے اطباء کا انتخاب تو درکنار، یہ بھی احساس نہیں ہوتا کہ ہم بیمار ہیں، انہی اخلاقی اور روحانی بیماریوں میں ایک بیماری حسد ہے، جو روح کے لیے ناسور بلکہ سرطان کی حیثیت رکھتا ہے، یہ ایک ایسا مہلک مرض ہے، جو انسان کو ہلاکت کے دہانے پر لے جاتا ہے اور انسان زندہ لاش بن کر رہ جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے سورۃ النساء میں ارشاد فرمایا ہے:

”أَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلٰى مَا آتَاهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ“۔ (النساء: ۵۴)

(کیا یہ لوگوں پر حسد کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے ان کو نعمت عطا کر دی ہے)۔

حسد ایسی بیماری ہے جو حاسد کو ہلاک کرنے اور اس کو آگ کی بھٹی میں جھونک دینے کا باعث بنتی ہے!!

حسد کہتے ہیں کہ کسی کے پاس اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی کوئی نعمت، کوئی صلاحیت، قابلیت یا ترقی دیکھ کر یہ آرزو کرنا کہ اُس سے یہ نعمت چھن جائے، اس کا یہ عہدہ ختم ہو جائے یا اس کی ترقی رک جائے، چاہے وہ نعمت اسے ملے یا نہ ملے، حسد آدمی کے اندر کینہ، بغض، غیبت، چغل خوری اور عداوت و دشمنی جیسے مہلک امراض کو جنم دیتا ہے، یہاں تک کہ اس کے تمام نیک اعمال اکارت چلے جاتے ہیں اور نیکیوں کی توفیق بھی اس سے سلب کر لی جاتی ہے، پھر اس کو مبغوض الخلائق میں شمار کر لیا جاتا ہے۔

ایک بہترین معاشرے کی تشکیل کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف مواقع پر حسد جیسے مہلک مرض سے بچنے کی بڑی تاکید فرمائی ہے اور بڑی وعید بھی سنائی ہے، ایک موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”إِيَّاكُمْ وَالْحَسَدَ، فَإِنَّ الْحَسَدَ يَأْكُلُ الْحَسَنَاتِ كَمَا تَأْكُلُ النَّارُ الْحَطَبَ“۔ (سنن أبي داود ۴۹۰۳)

حسد سے بچو، کیوں کہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ لکڑیوں کو کھا جاتی ہے۔

ایک دوسری حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

”لا تقاطعوا ولا تدابروا ولا تباغضوا ولا تحاسدوا وكونوا عباد اللهِ إخوانًا ولا يحل لمسلمٍ أن يهجر أخاه فوق ثلاث“۔ (رواہ البخاری ۶۰۶۵)

ترجمہ: آپس میں ایک دوسرے سے قطع تعلق نہ کرو، ایک دوسرے سے اعراض نہ کرو اور آپس میں ایک دوسرے سے بغض نہ رکھو اور آپس میں ایک دوسرے سے حسد نہ کرو اور اللہ کے بندے بھائی بھائی بن کر رہو اور کسی بھی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو تین دن سے زیادہ چھوڑے رکھے، یعنی اس سے بات نہ کرے۔

مضارب بن حزنؒ کہتے ہیں کہ: ”حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ لوگوں کو حضرت عثمانؓ کے قتل پر کس چیز نے ابھارا؟ تو آپؓ نے فرمایا کہ: ”حسد“ نے۔“ (کتاب السنۃ: ۵۵۶/۲)

امام ابن عیینہؒ فرماتے ہیں: ”حسد“ وہ پہلا گناہ ہے جو آسمان پر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کر کے کیا گیا، یعنی شیطان نے حضرت آدم علیہ السلام پر حسد کیا اور یہی وہ پہلا گناہ ہے جو زمین پر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کر کے کیا گیا، یعنی حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹے نے اپنے بھائی پر حسد کیا اور اس کو قتل کر دیا۔

(المجالسۃ وجواہر العلم، ج:3، ص:51)

امام غزالیؒ نے اپنی کتاب ''احیاء علوم الدین'' میں ایک روایت نقل کی ہے، جس سے حسد کی مذمت اور اس کی قباحت معلوم ہوتی ہے:

''چھ قسم کے لوگوں کو چھ گناہوں کی وجہ سے حساب سے پہلے ہی جہنم میں داخل کر دیا جائے گا، ان میں امراء و حکام ظلم کی وجہ سے، عرب عصبیت کی وجہ سے، چودھری تکبر کی وجہ سے، تاجر خیانت کی وجہ سے، دیہاتی جہالت کی وجہ سے اور علماء حسد کی وجہ سے۔''

(کتاب ذم الغضب و الحقد و الحسد)

حسد ہونے کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ انسان جب احساسِ کمتری کا شکار ہوتا ہے تو اس کے اندر دوسروں کی کامیابی اور ترقی دیکھ کر بغض و کینہ پیدا ہوجاتا ہے، یہاں تک کہ یہ عداوت پر اتر آتا ہے اور پھر حسد کی آگ میں جلنا شروع ہوجاتا ہے، یہ بغض، کینہ، عداوت و دشمنی ایسی بیماریاں ہیں کہ آدمی کو دوسرے کی راحت، ان کی ترقی اور عہدہ و منصب کا ملنا تکلیف پہنچاتا ہے، اس کی خوشی ایک آنکھ نہیں بھاتی۔

حسد ایک ایسا ناسور ہے، جو انسانی روح کو دھیرے دھیرے ختم کر دیتا ہے اور انسان کو خبر بھی نہیں ہوتی، حاسدین ایسی آگ میں جھلستے رہتے ہیں کہ ان کو کسی پہلو سکون و راحت نہیں ملتا، وہ ایسی بے چینی اور بے قراری میں ہوتے ہیں کہ نہ وہ سکون سے کھا سکتے ہیں اور نہ سو سکتے ہیں، یہی حسد ان کو ایسے ایسے گناہوں میں مبتلا کر دیتا ہے کہ جس کے بعد ہلاکت ہی ہوتی ہے۔

درحقیقت حسد کرنے والا سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر اعتراض کا مرتکب ہوتا ہے، بزبانِ حال وہ یہ کہتا ہے کہ اے اللہ آپ نے اس کو یہ نعمت، یہ عہدہ و منصب کیوں دیا؟ یہ تو مجھے ملنا چاہیے تھا، اس کا تو میں مستحق تھا، یہ مال و دولت اس کو کیوں ملا، مجھے ملنا چاہیے تھا!! یہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر اعتراض ہے۔

دوسری بات یہ کہ حاسد محسود پر غیبت، چغل خوری، جھوٹ اور بہتان تراشی کرنے سے بھی پیچھے نہیں رہتا اور نقصان پہنچانے کی تمام تر کوششیں کر ڈالتا ہے، حتیٰ کہ اس کی جان لینے کے درپے ہوجاتا ہے اور تاریخِ انسانی میں اس کے نمونے موجود ہیں۔

ہمارے معاشرہ میں حسد کی بیماری بالکل عام ہے، موجودہ دور میں اگر کوئی اس بیماری سے محفوظ ہے اور اپنے قلب کو بغض و حسد، کینہ و عداوت سے پاک صاف رکھتا ہے تو وہ اللہ کا ولی ہے اور ایسے شخص کے لیے جنت کی بشارت ہے، حسد کے نتیجہ میں جب آدمی کسی کی برائی کرتا ہے، کسی کو عار دلاتا ہے، مجلس میں بیٹھ کر اس کی عزت اچھالتا ہے اور اس کو بدنام کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کے لیے حدیث شریف میں بڑی سخت وعید ہے، ترمذی شریف کی روایت ہے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''من عير أخاه بذنب لم يمت حتى يعمله''۔ (رواه الترمذي: ۲۵۰۵)

ترجمہ: جس شخص نے اپنے مسلمان بھائی کو اس کے کسی گناہ پر عار دلائی، وہ اس وقت تک مرنہیں سکتا، جب تک کہ وہ خود اس گناہ کا مرتکب نہ ہوجائے۔

یہ بہت سخت وعید ہے اور حاسد کے اندر یہ بات ہوتی ہے کہ محسود کسی بھی طریقے سے ذلیل و خوار ہو، اس کی عزت کو داغدار کیا جائے، اس کی ترقی روک دی جائے اور حقیقت یہ ہے کہ ایسا شخص مسلمان نہیں ہوسکتا، جس کے دل میں اپنے مسلمان بھائی کے لیے ایسے ناپاک جذبات پنپ رہے ہوں۔

حدیث پاک میں ہے کہ مسلمان وہ ہے، جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان بھائی محفوظ رہیں، لیکن ہمارے معاشرے کی حالت یہ ہے کہ ہر ایک دوسرے سے خائف رہتا ہے کہ کہیں سامنے والا اسے ذلیل نہ کر دے یا اس کی عزت پر حملہ نہ کر دے۔

کیا ہم اپنے اس مفلوج اور بیمار معاشرے کو اسلامی معاشرہ کہہ سکتے ہیں!! جبکہ ہماری کوئی مجلس ایسی نہیں ہوتی، جہاں کسی کی عزت کو تار تار نہ کیا جاتا ہو، اگر دس لوگ مجلس میں ہیں اور ان میں ایک آدمی تبصرہ کرنے والا، اہل مجلس کو کسی غائب شخص کے تعلق سے بدگمانی پیدا کر رہا ہو، تو اہل مجلس میں کوئی ایک فرد بھی ایسا نہیں ہوتا جو اس کو روکے یا ٹوکے کہ کسی کی برائی نہ کرو، حسنِ ظن رکھو یا تحقیق کر لو، بغیر تحقیق کے بات نہ کرو، جبکہ بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ تنکے کا پہاڑ اور سوئی کا پھاوڑا بنا دیا جاتا ہے اور یہ سب اسی حسد کے نتیجہ میں ہوتا ہے جو انتقامی جذبے میں منتقل ہو جاتا ہے، حقیقت میں مسلمان تو وہ ہے، جس کے دل میں دوسرے مسلمان کے لیے خیر خواہی کے جذبات ہوں، الفت و محبت ہو، تواضع و خاکساری ہو، ایثار و قربانی ہو، نرمی و لطافت ہو، گفتار و کردار میں صداقت ہو، عمدہ اخلاق کا پیکر جمیل ہو اور ہر قسم کی روحانی بیماریوں سے پاک صاف ہو، دل آئینہ کی طرح صاف و شفاف ہو۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کی اس خطرناک اور مہلک بیماری سے حفاظت فرمائے اور ہمارے معاشرے کو حقیقی معنی میں اسلامی معاشرہ بنائے۔ آمین!

☆☆☆

نورِ ھدایت

حجِ بیت اللہ عشقِ الٰہی کی معراج

محمد جاوید اختر ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

حج محض ایک عبادت نہیں، بلکہ بندۂ مومن کے دل کی گہرائیوں سے اٹھنے والی ایک ایسی پکار کا جواب ہے، جس میں عشق، شوق، فداکاری اور اطاعت کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے، حج کا لباس ہمیں یاد دلاتا ہے کہ انسان دنیا میں عارضی ہے، اصل زندگی آخرت کی ہے، دو سفید چادروں میں ملبوس ہوکر انسان اپنی اصل حقیقت کو پہچانتا ہے کہ وہ ایک مسافر ہے، جو ایک دن اپنے رب کے حضور حاضر ہوگا، یہ محبت کا وہ سفر ہے جس میں بندہ اپنے رب سے قریب تر ہوجاتا ہے، یہ انسان کے اندر ایک نئی روح پھونک دیتا ہے، جو شخص خلوصِ نیت کے ساتھ یہ سفر مکمل کرتا ہے، وہ گناہوں سے اس طرح پاک ہوجاتا ہے جیسے ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہو۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے خلیل حضرت ابراہیمؑ کو کئی انعامات عطا فرمائے اور ان میں سب سے بڑا انعام یہ دیا کہ عبادت حج کو حضرت ابراہیمؑ اور ان کے گھرانے کے نام منسوب کر دیا، حضرت ابراہیمؑ عاشق صادق تھے، حج عاشقانہ عبادت ہے، ابتداء سے انتہاء تک پوری عبادت عشق سے عبارت ہے، لوگ اپنے دل میں بیت اللہ کے طواف اور روضۂ رسول ﷺ پہ حاضری کی جستجو لے کر احرام باندھ کے نکل پڑتے ہیں، ہر سال انسانوں کا جم غفیر کئی ممالک سے ایک ہی مقام پہ جمع ہوتا ہے، اس کی کیا وجہ ہے اور یہ بھی کہ وہاں کیوں مذہبی رسوم ادا کی جاتی ہیں، آخر اس عبادتِ حج کی کیا اہمیت ہے؟ ان تمام باتوں پہ غور کرنے کے لیے ہمیں کلامِ الٰہی سے رہنمائی لینی چاہیے، یہ عبادت بڑی محبوب ہے، اس کی فضلیت اور شان کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ قرآن میں ایک سورہ نازل کی گئی، اس میں رب کریم نے حج کے احکام وفضائل بیان کیے ہیں اور اس سورہ کا نام ہی "سورۃ حج" رکھا گیا ہے، اس سورہ کا آغاز اس آیت کریمہ سے ہوا ہے: "یایھا الناس اتقوا ربکم ان زلزلۃ الساعۃ شئی عظیم" (اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو، بے شک قیامت کا زلزلہ ایک ہولناک شے ہے)، یہ سورہ پڑھ کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں، کاش کہ آج کا مسلمان اس سورہ کو دل کی تڑپ کے ساتھ تلاوت کرتا، یہ سورہ تو حج کے متعلق ہے، لیکن ابتدائی آیات میں قیامت کا ذکر ہے، حج کی عبادت عرفات کے میدان میں حاضری سے ادا ہوتی ہے، یہ ایک وسیع وعریض کھلا میدان ہے جہاں دنیا بھر سے آئے ہوئے ہر رنگ، ہر نسل اور ہر زبان، ہر قوم، ہر عمر، ہر شکل کے مسلمان جمع ہوتے ہیں، یہاں بڑے چھوٹے، شاہ وگدا میں کوئی امتیاز نہیں، سب کی ایک ہی حالت اور کیفیت ہوتی ہے۔

لاکھوں فرزندانِ توحید آج سے ہزاروں برس پہلے دی گئی ندائے ابراہیم کا جواب دینے کے لیے یہاں اکھٹے ہوتے ہیں اور ساتھ ہی یہ اعلان بھی کرتے ہیں کہ تیرا کوئی شریک نہیں، تیری ذات تمام صفات کی مالک ہے، سب نعمتیں تیرے قبضۂ قدرت میں ہیں، ملک بھی تیری، حکومتیں بھی تیری، بس ایک اعلان کے لیے ساری خدائی یہاں مرکزی مقام پہ جمع ہوتی ہے، یہاں جمع ہونے کا ایک مقصد تو یہ ہے کہ کل عالم اسلام کے مسلمان اجتماعی طور پر اللہ پاک کی الوہیت و عظمت اور کبریائی بیان کریں، دوسرا مقصد جو سورۂ حج کے آغاز میں ہے، جس طرح میدانِ عرفات میں ہر رنگ، نسل، قوم، زبان، عقل وشکل کے مختلف انسان جمع ہیں، اس اجتماع اور اس میدان سے میدانِ حشر اور آخرت کے اجتماع کی یاد تازہ کریں اور سوچیں کہ ایک دن وہ بڑا اجتماع بھی منعقد ہونے والا ہے جہاں اسی طرح دنیا بھر کی مختلف قوموں، نسلوں اور مختلف زبانوں سے تعلق رکھنے والے انسان ہوں گے، یہ اجتماع دراصل میدانِ حشر میں ہونے والے اجتماع کی یاد تازہ کرنے کے لیے منعقد ہوتا ہے تاکہ امتِ مصطفی ﷺ کے اعمال میں اخلاص پیدا ہو اور وہ دنیا ہی کے اندر اپنی اصلاح کرسکیں۔

حج کا ایک اور مقصد یہ ہے کہ اس عبادت کے اندر اجتماعیت ہے، ہمارا دین ایک عالمگیر دین ہے، اگر کوئی شخص اپنے گھر میں اکیلا نماز پڑھ لے تو ایک نماز کا ثواب دس نمازوں کے برابر ملے گا اور اگر وہی نماز شہر کی مرکزی مسجد میں ادا کرے تو پچاس نمازوں کا ثواب ملے گا، اسی طرح اگر اور اہم جگہ چلا گیا تو ثواب بڑھ جائے گا، یہاں تک کہ اگر مسجد اقصیٰ میں وہی نماز ادا کی گئی تو اسے پچاس ہزار نمازوں کا ثواب ملے گا اور بیت اللہ میں وہی نماز ادا کی گئی تو اسے ایک لاکھ نمازوں کا ثواب ملے گا، اب سوچنے کی بات ہے کہ نماز وہی ہے، ثواب میں زیادتی آتی گئی، اس بات سے یہ معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے اندر جوں جوں مرکزیت اور اجتماعیت بڑھے گی، اجر وثواب میں کئی گنا اضافہ ہوتا جائے گا، حج بیت اللہ اور میدانِ عرفات میں مسلمانوں کی وحدتِ فکر اور وحدتِ عمل کا سب سے بڑا اجتماع ہوتا ہے، اتحاد میں برکت ہے، حج کا سب سے بڑا مقصد یہی ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ کی امت اتحاد کی سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جائے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو حج بیت اللہ نصیب فرمائے، آمین۔

☆☆☆

احوالِ عالم

اسرائیل کا قانون سزائے موت

محمد نفیس خان ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

آسمان سے برستی آگ۔زمین سے ابلتا لہو۔ فضا میں بکھرے انسانی اعضاء۔جلتے مکانات سے اٹھتا دھواں۔دلوں کو چیرنے والی چیخیں۔ پامال ہوتی عصمتیں۔کھنڈرات میں بدلتی بستیاں۔ ملبے کا ڈھیر بنتے ہسپتال۔تباہ ہوتے اسکول۔ناکہ بندیاں۔نوجوانوں کی گرفتاریاں۔جنسی تشدد۔ قیدیوں پر مظالم۔بھکمری۔امدادی کارکنوں پر حملے۔جبری نقل مکانی۔فوجی آپریشنز کے نام پر غارت گری۔غذا و ادویہ پر پابندی۔مسلسل نسل کشی۔تقریباً ایک لاکھ سے زائد فلسطینیوں کی درد بھری موت اور پھر غزہ کے کھنڈرات۔مظالم کی ایک لمبی فہرست۔دردوالم کی ایک طویل داستاں!

حیا سوز، اخلاق سوز، انسانیت سوز ان مظالم کے باوجود اسرائیل کا دعوی ہے کہ اس کے وجود کو فلسطینیوں سے خطرہ ہے، اس کے شہریوں کی جان و مال محفوظ نہیں، اس کے اپنے لوگ دہشت کے سایہ میں سانسیں لے رہے ہیں، اس لیے وہ سخت سے سخت قانون بنانے پر مجبور ہے۔

وہی جلائے ہے بستی، وہی فغاں بھی کرے
عجب ہے ظلم کہ خود ہی بیاں بھی کرے

اسی بے بنیاد دعویٰ کے تحت ۳۰/مارچ ۲۰۲۶ء کو اسرائیلی پارلیمنٹ ''کنیسٹ'' (Knesset) نے ایک انتہائی متنازعہ بل منظور کیا جس کا نام ہے: ''دہشت گردوں کے لیے سزائے موت کا قانون'' "Death Penalty for Terrorists Law"

اس قانون کے تحت ''دہشت گردی'' کے مقدمات میں سزائے موت کو لازمی قرار دے دیا گیا ہے۔گویا عدالتی کارروائی کا مقصد محض کسی ملزم کو مجرم یا بے گناہ ثابت کرنا نہیں ہوگا، بلکہ بحث اس بات پر ہوگی کہ آیا گرفتار شخص کو سزائے موت دی جائے یا کسی استثنائی صورت میں اس کی سزا کو عمر قید میں تبدیل کیا جائے۔

یہ قانون دو الگ الگ عدالتی نظاموں پر مبنی ہے: ایک کا تعلق مقبوضہ مغربی کنارے (West Bank) میں فوجی عدالتوں سے ہے۔یعنی کوئی بھی فلسطینی اگر ''دہشت گردی'' کے الزام میں دانستہ قتل (Fatal Terrorist Attack) کا مرتکب پایا جائے تو سزائے موت ڈیفالٹ (Default) ہوگی۔عدالت کو صرف ''خاص حالات'' (Special Circumstances) میں عمر قید کا اختیار ہے، جو تحریری طور پر ریکارڈ کرنا ہوگا۔ پھانسی کا طریقہ لٹکانا (Hanging) ہوگا۔سزا کے حتمی فیصلے کے نوے دن کے اندر عمل درآمد لازمی ہے۔

دوسرے کا تعلق اسرائیل کے اندر سول عدالتوں سے ہے یعنی جو کوئی بھی دانستہ قتل کرے اور اس کا مقصد ''اسرائیل کے وجود کو ختم کرنا'' ہو، اسے سزائے موت یا عمر قید دی جاسکتی ہے۔یہ شق خاص طور پر یہودی آبادکاروں یا اسرائیلیوں کے جرائم کو خارج رکھنے کے لیے بنائی گئی ہے۔

۱۹۴۸ء سے اسرائیل میں سزائے موت کا قانون نافذ ہے لیکن صرف انسانیت کے خلاف جرائم اور غداری کے لیے اس کا نفاذ ہوتا تھا۔آخری بار ۱۹۶۲ء میں نازی مجرم ''ایڈولف آئخمن'' کو پھانسی دی گئی تھی۔عام جرائم میں یہ عملاً معطل رہی ہے۔

۷/اکتوبر ۲۰۲۳ کو حماس کے سخت ترین حملوں (الاقصی آپریشن) کے بعد دائیں بازو کی حکومت نے دہشت گردی کے خلاف سخت اقدامات کا سلسلہ شروع کیا، جس کا ایک اہم حصہ یہ نیا قانون ہے۔

اس قانون کی منظوری کے ساتھ اسرائیل نے ایک بار پھر یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ نہ صرف طاقت کے بل بوتے پر فلسطینیوں کی مزاحمت کو کچلنا چاہتا ہے بلکہ اسے قانونی جواز بھی فراہم کرنا چاہتا ہے۔ یہ قانون، دراصل ایک ایسا ہتھیار ہے جو اسرائیلی فوجی عدالتوں کو فلسطینی نوجوانوں، مزاحمت کاروں اور عام شہریوں کو بھی، جن پر ''دہشت گردی'' کا لیبل لگا دیا جائے، بغیر کسی حقیقی انصاف کے پھانسی کے پھندے تک پہنچانے کا اختیار دے گا۔

یہ قانون نہ صرف بین الاقوامی انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہے بلکہ یہ اسرائیل کی اس حقیقت کو بھی بے نقاب کرتا ہے کہ وہ اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لیے انصاف، اخلاقیات اور انسانی اقدار کو بالکل نظر انداز کرنے پر تیار ہے۔

اس قانون کی منظوری سے یہ بات بالکل واضح ہوگئی ہے کہ اسرائیل امن کی راہ پر چلنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔وہ نہ تو ''دو ریاستی حل'' قبول کرنا چاہتا ہے اور نہ ہی فلسطینیوں کو ان کا بنیادی حق دینا چاہتا ہے۔ اس کے بجائے وہ مسلسل جبر، قبضہ، نسل کشی اور اب قانونی طور پر سزائے موت جیسے ہتھیاروں کے ذریعے فلسطینی قوم کو ختم کرنے یا انھیں مکمل طور پر غلام بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔

☆☆☆

فقہی مسائل

سوال وجواب

مفتی محمد ظفر عالم ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

سوال: ایک شخص ملازمت سے ریٹائرڈ ہو چکا ہے، مختلف فنڈوں سے جو رقمیں ملی تھیں وہ سب بچوں کی شادیوں میں صرف ہوگئیں، اب ان کے پاس اتنے روپے نہیں رہے کہ وہ سفر حج کرسکیں، البتہ ان کے پاس کچھ جائیدادیں ہیں، جو مستقبل میں اولادوں کے کام کے لیے ہیں، سوال یہ ہے کہ کیا ایسے شخص پر حج فرض ہے؟ اگر فرض ہے تو کیا کچھ جائیدادیں فروخت کر کے جا سکتے ہیں جبکہ اس صورت میں اندیشہ ہے کہ اولادوں کی جائیدادیں کم ہوجائیں گی؟

جواب: اگر کسی شخص کے پاس نقد رقم موجود نہ ہو لیکن اپنی بنیادی ضروریات کے علاوہ جائیدادیں موجود ہوں جن میں سے کچھ فروخت کر کے حج کرسکتے ہیں تو ایسے شخص پر حج کرنا فرض ہے خواہ اپنی جائیداد کا کچھ حصہ فروخت کر کے یا دوسروں سے قرض لے کر حج کرے۔

[الدرالمختار مع ردالمحتار: ۳/۴۵۵]

سوال: ایک شخص مقروض ہے، ابھی قرض کی ادائیگی نہیں ہوسکی ہے، کچھ احباب حج کرنے جا رہے ہیں، ان کا بھی ارادہ حج کا ہو رہا ہے، سوال یہ ہے کہ قرض ادا کرے یا حج کرے، اگر قرض ادا کریں تو پھر حج پر جانے کے بقدر مال نہیں بچتا، ایسی صورت میں یہ شخص کیا کرے؟

جواب: ایسے شخص کے لیے پہلے قرضوں کی ادائیگی کی فکر کرنا ضروری ہے کیونکہ قرض حقوق العباد میں ہے اور حج حقوق اللہ میں ہے، حقوق العباد کی ادائیگی کو مقدم کرے پھر حج کرنے کا انتظام کریں۔

سوال: ایک پر دوسروں کے قرضے ہیں جو ابھی ادا نہیں ہوئے ہیں، ان کو کچھ احباب اپنے ساتھ اپنے خرچوں پر لے جانا چاہتے ہیں، سوال یہ ہے کہ کیا ایسا شخص قرضے ادا کیے بغیر دوسروں کے اخراجات پر حج کرسکتا ہے؟ کیا اس سے اس کا حج فرض ادا ہوجائے گا؟

جواب: اگر کوئی مقروض ہو اور اس کو کچھ لوگ حج کرانے لے جائیں تو اسے حج کر لینا چاہیے، اس طرح اس کا حج ادا ہوجائے گا، دوسروں کی طرف سے جب حج میں جانے کا انتظام ہوجائے تو یہ قدرت میں داخل ہے، اس کو نظر انداز کرنا بڑی محرومی ہے، قرآنی آیت میں یہ صراحت موجود ہے کہ جس کو بیت اللہ تک پہنچنے کی قدرت ہو اس پر حج فرض ہوجاتا ہے، لہٰذا اس طرح حج پر قدرت ہونا اور موقع ملنا اور اس کو ادا کرنا فرض کی ادائیگی ہوگی اور حج کی فرضیت ساقط ہوجائے گی۔

سوال: ایک خاتون کے پاس اپنی رقوم موجود ہیں کہ حج کرسکیں، ان کے والدین حج پر جا رہے ہیں، ان کی خواہش ہے کہ والدین کے ساتھ حج کرلیں لیکن شوہر منع کر رہے ہیں اور یہ کہہ رہے ہیں کہ جب میرے پاس حج کے بقدر پیسے ہوجائیں گے تو دونوں ساتھ جائیں گے، یہ خاتون کے مخمصہ میں ہیں، اب وہ کیا کریں؟

جواب: استطاعت نہ ہونے کی وجہ سے فی الوقت شوہر پہ حج فرض نہیں ہے، اس لیے ان کا ابھی نہ جانا باعث گناہ نہیں، لیکن مذکورہ خاتون چونکہ حج کے لیے جانے کی استطاعت رکھتی ہیں جس کی وجہ سے ان پر حج فرض ہوچکا ہے، مالی استطاعت بھی ہے اور محرم کی رفاقت بھی حاصل ہو رہی ہے، اگر تاخیر ہوئی اور خدانخواستہ آئندہ حج کا موقع نہیں ملا اور دنیا سے چلی گئیں تو گنہگار ہوں گی، اس لیے شوہر کو منع نہیں کرنا چاہیے، بلکہ خوش دلی سے اجازت دینی چاہیے۔

[بدائع الصنائع: ۲/۱۲۴]

سوال: ایک صاحب حج کر چکے ہیں، اب دوبارہ حج کے لیے جانا چاہتے ہیں، جبکہ ان کے والدین نے حج نہیں کیا ہے، سوال یہ ہے کہ وہ خود حج کریں یا والدین کو حج کرائیں؟ اگر والدین کے بجائے خود حج کو جائیں تو یہ درست ہوگا؟

جواب: اگر ان کے والدین پر حج فرض نہ ہو تو خود حج پر جاسکتے ہیں، اور اگر والدین پر حج فرض تھا، کسی کوتاہی سے نہیں کرسکے اور اب استطاعت نہیں رہی تو اپنے نفلی حج کرنے کے بجائے والدین کو حج پر بھیجیں تاکہ ان کو گناہ سے بچایا جاسکے۔

[کتاب الفتاویٰ: ۸/۴۱۴]

سوال: ایک شخص کرایہ کے مکان میں رہتا ہے اور اس کے پاس حج کی رقم موجود ہے، اتفاق سے اسی محلہ میں ایک مکان بک رہا ہے، کیا یہ شخص حج کرے یا ذاتی مکان خریدے؟

جواب: سفر حج کی کاروائیوں اور تاریخوں سے قبل اگر مکان اس نے خرید لیا اور اتنی رقم نہیں بچی کہ حج کرسکے تو اس پر ابھی حج فرض نہیں ہوا، اس لیے فی الوقت جانا ضروری نہیں، ہاں! اگر حج کی قانونی کاروائیاں ہو رہی ہیں اور عازمین حج بھی سفر کا انتظام و انصرام کر رہے ہیں اور انھوں نے ابھی مکان نہیں خریدا ہے تو پہلے حج کریں، پھر مکان کی فکر کریں۔

[الدرالمختار مع ردالمحتار: ۲/۴۶۱]

☆☆☆

منزل بہ منزل

رپورٹ ناظم ندوۃ العلماء

پیش کردہ جلسہ مجلس انتظامی ندوۃ العلماء لکھنؤ

(منعقدہ مورخہ ۱۶/شوال ۱۴۴۷ھ مطابق ۵/اپریل ۲۰۲۶ء بروز اتوار)

الحمدللہ رب العالمین، والصلاۃ والسلام علیٰ سید المرسلین وخاتم النبیین محمد، وعلیٰ آلہ وصحبہ أجمعین وبعد!

حضرات اراکین مجلس انتظامی ندوۃ العلماء!

ندوۃ العلماء کے ایک خادم کی حیثیت سے میں آپ کا استقبال کرتا ہوں اور شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ حضرات سفر کی صعوبتیں برداشت کرکے مجلس انتظامی میں شرکت کے لیے تشریف لائے۔ امید ہے کہ آج کی یہ مجلس جس میں ملک کے منتخب علماء، دانشور اور اصحاب فکر ودعوت شریک ہیں، صرف ندوۃ العلماء ہی کے لیے نہیں؛ بلکہ پورے ملک کے لیے مفید اور نتیجہ خیز ثابت ہوگی۔

تحریک ندوۃ العلماء جس فکر وجامعیت کے ساتھ وجود میں آئی تھی اور قلب وعقل کا اس نے جو آمیزہ تیار کیا تھا، الحمد للہ آج دنیا میں اس کے اثرات محسوس کیے جارہے ہیں۔ بانی ندوۃ العلماء حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ اور معمار ندوۃ العلماء علامہ شبلی نعمانیؒ نے قلب ودماغ کا جو آمیزہ تیار کیا تھا، وہ سید الطائفہ علامہ سید سلیمان ندویؒ اور مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی شخصیتوں کی شکل میں جلوہ گر ہوا، علامہ اقبال کو یہ کہنا پڑا کہ ”شریعت اسلامیہ کے جوئے شیر کا فرہاد سید سلیمان کے سوا کون ہوسکتا ہے؟“ اور مشہور صاحب قلم پروفیسر خورشید احمد صاحب نے حضرت مولانا علی میاںؒ کے وصال کے بعد یہ لکھا کہ ”مولانا اپنی تحریروں میں دل کے راستے سے داخل ہوتے ہیں اور دماغ پر چھا جاتے ہیں“۔

واقعہ یہ ہے کہ اس وقت دار العلوم ندوۃ العلماء کے لیے ان دونوں شخصیتوں سے بہتر کوئی آئیڈیل ملنا مشکل ہے، جن میں دل دردمند، فکر ارجمند اور زبان ہوش مند کی ایسی خوبصورت یکجائی نظر آتی ہے جو اس دور کی بڑی ضرورت ہے۔

تحریک ندوۃ العلماء جس دور میں شروع ہوئی، وہ اس وقت کی اہم ترین ضرورت تھی، مسلکی اختلافات عروج پر تھے، علماء دین اور عصری تعلیم یافتہ طبقہ کے درمیان ایسی خلیج حائل تھی کہ اس کا پاٹنا جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا، ندوۃ العلماء کی اساس اسی پر پڑی، ایک طرف رفع نزاع باہمی اور دوسری طرف ایسے علماء کو تیار کرنا جو ہر طبقہ کے سامنے دین کی مکمل ترجمانی کرسکیں، مخاطب کی نفسیات اور زبان سے واقف ہوں اور رسوخ فی العلم کی صفت سے متصف ہوں۔ ندوۃ العلماء نے اس کے لیے دار العلوم قائم کیا، جدید نصاب تعلیم تیار کیا اور الحمد للہ اس نے جو صدا لگائی تھی اس کی بازگشت آج ہر جگہ سنائی دیتی ہے، ندوہ کی دعوت قبول کی گئی اور اپنے اپنے طور پر مختلف اداروں اور تحریکات نے یہ کام اوڑھ لیا۔

موجودہ حالات میں فکر ندوۃ العلماء کی افادیت دو چند نظر آتی ہے، اس وقت اس کی ضرورت اور زیادہ ہے، فروعی اختلافات کو پس پشت ڈال کر امت کو ایک لڑی میں پرویا جائے اور مختلف طبقوں کی صلاحتوں کو امت کی فلاح و بہبود کے لیے استعمال کیا جائے؛ لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ عقائد واصول میں پورا تصلب قائم رہے، یہ امت جن اصولوں کو ہمیشہ اپنے سینے سے لگائے رہی اور جس طرح اس نے ہمیشہ دین کی حفاظت کا کام کیا جس کا ذکر حدیث میں کیا گیا ہے: ”**یحمل هذا العلم من کل خلف عدوله، ینفون عنه تحریف الغالین، وانتحال المبطلین، وتأویل الجاهلین ..**“ (بیهقی) (اس علم کے ہر نسل میں ایسے عادل ومتقی حامل ووارث ہوں گے جو اس سے غلو پسند لوگوں کی تحریفات، اہل باطل کے غلط انتساب ودعوے اور جاہلوں کی دور از کار تاویلات کا پردہ چاک کرتے رہیں گے)۔

یہاں اس غلط فہمی کا ازالہ بھی ضروری ہے کہ وسعت کا مطلب انحراف وتحریف نہیں ہے، اصول دین اور عقائد اسلامیہ سے تھوڑی دیر کے لیے بھی صرف نظر ممکن نہیں، تحریک ندوۃ العلماء کا یہی توازن ہے جو ہر دور میں اس کی افادیت و معنویت کو اجاگر کرتا ہے۔

اس دور میں ایک طرف وہ طبقہ ہے جو اپنے کسی معمول سے بھی دست بردار ہونے کو تیار نہیں اور دوسری طرف دین میں تحریف کرنے سے بھی کوئی گریز نہیں، زبان وقلم کی طاقت رکھنے والوں

کا ایک گروہ دین کو زمانہ کے رخ پر لانا چاہتا ہے اور اس کے لیے وہ دین میں ہر طرح کی کتر و بیونت کرنے کے لیے تیار ہے اور نوجوانوں کا بڑا طبقہ ان کے زور بیان کا گرویدہ ہے، وہ اپنی منزل سے بے خبر ہوا کے دوش پر اڑا جا رہا ہے اور اس کو یہ پتہ نہیں کہ یہ ہوا اس کو کہاں لے جا کر گرائے گی، وہ اپنے انجام سے بے خبر ہے۔

ان حالات میں فکر ندوۃ العلماء کی افادیت بہت بڑھ جاتی ہے، بہت اہم کام امت میں وحدت پیدا کرنے کا ہے، لیکن پورے تحفظ کے ساتھ بنیادوں پر قائم رہتے ہوئے کہیں بھی عقیدہ واصول سے انحراف نہ ہو، لیکن فروعات ووسائل میں ہرگز شدت نہ اختیار کی جائے۔ کسی ایک رخ پر بہہ جانا آسان ہوتا ہے؛ لیکن اعتدال کے ساتھ قائم رہنا قدرے مشکل ہے، ندوۃ العلماء نے اسی مشکل لیکن ضروری کام کو اختیار کیا ہے۔

تحریک ندوۃ العلماء کی فکری بنیادوں، اسکے اعتقادی اور فکری حدود اربعہ اور اسکے نمایاں خط وخال کو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے جس طرح واضح فرمایا ہے، اسکی حیثیت ندوۃ العلماء کے بنیادی اصولوں کی ہے، وہ تحریر فرماتے ہیں:

”☆ دین وعقائد کے معاملہ میں ندوۃ العلماء کے مسلک کی بنیاد دینِ خالص پر ہے، جو ہر قسم کی آمیزش اور آلائش سے پاک ہے، تاویل اور تحریف سے بلند، ملاوٹ اور فریب کی دسترس سے دور اور ہر اعتبار سے مکمل اور محفوظ ہے۔

☆ دین کے فہم اور اس کی تشریح اور تعبیر میں اس کی بنیاد اسلام کے اولین اور صاف وشفاف سرچشموں سے استفادہ اور اس کی اصل کی طرف رجوع پر ہے۔

☆ اعمال واخلاق کے شعبہ میں دین کے جوہر ومغز کو اختیار کرنے، اس پر مضبوطی سے قائم رہنے، احکام شرعیہ پر عمل، حقیقت دین اور روح دین سے زیادہ قربت اور تقوی اور صلاح باطن پر ہے۔

☆ تصورِ تاریخ میں اس کی بنیاد اس پر ہے کہ اسلام کے ظہور اور عروج کا دور اول سب سے بہتر اور قابل احترام دور اور وہ نسل جس نے آغوشِ نبوت اور درس گاہ رسالت میں تربیت پائی اور قرآن وایمان کے مدرسہ سے تیار ہو کر نکلی، سب سے زیادہ مثالی اور قابل تقلید نسل ہے اور ہماری سعادت ونجات اور فلاح وکامرانی اس بات پر منحصر ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ اس سے استفادہ کریں اور اس کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کریں۔

☆ نظریۂ علم اور فلسفۂ تعلیم میں اس کی اساس اس پر ہے کہ علم بذات خود ایک اکائی ہے، جو قدیم وجدید اور مشرق ومغرب کے خانوں میں تقسیم نہیں کی جاسکتی، اگر اس کی کوئی تقسیم ممکن ہے تو وہ تقسیم صحیح اور غلط، مفید اور مضر اور ذرائع اور مقاصد کے اعتبار سے ہوگی۔

☆ استفادہ اور افادہ اور ترک وقبول کے شعبہ میں اس کا عمل اس حکیمانہ نبوی تعلیم پر ہے کہ ”حکمت مومن کا گمشدہ مال ہے جہاں بھی وہ اس کو پائے وہ اس کا سب سے زیادہ مستحق ہے“ نیز قدیم حکیمانہ اسلوب ”خذ ما صفا ودع ما کدر“ پر (یعنی جو صاف ونظیف ہو اس کو لے لو اور جو آلودہ اور کثیف ہو اس کو چھوڑ دو)۔

☆ اسلام کے دفاع اور عصر حاضر کی لادینی قوتوں کے مقابلہ میں اس کی اساس اس ارشاد ربانی پر ہے: ”وأعدوا لهم ما استطعتم من قوة“ [سورہ انفال: ۶۰] ان کے مقابلہ کے لیے جتنی قوت تم سے ممکن ہو سکے، تیار کرو۔

☆ دعوت الی اللہ، اسلام کے محاسن وفضائل کی تشریح اور ذہن وعقل کو اس کی حقانیت وصداقت پر مطمئن کرنے میں اس کا عمل اس حکیمانہ وصیت پر ہے کہ: ”**كلموا الناس على قدر عقولهم، أتريدون أن يكذب الله ورسوله**“ (لوگوں سے ان کی عقلوں کا خیال رکھتے ہوئے گفتگو کرو، کیا تم چاہتے ہو کہ خدا اور رسول کو جھٹلا دیا جائے؟)۔

☆ عقائد واصول میں وہ جمہور اہل سنت کے مسلک کی پابندی اور سلف کے آراء وتحقیقات کے دائرہ میں محدود رہنا ضروری سمجھتا ہے، فروعی اور فقہی مسائل کے بارے میں اس کا مسلک واصول یہ ہے کہ حتی الامکان اختلافی مسائل کو چھیڑنے اور ہر ایسے طرز عمل سے احتراز کیا جائے جس سے باہمی منافرت بڑھے اور امت کا شیرازہ منتشر ہو، سلف صالحین سے حسن ظن رکھا جائے اور ان کے لیے عذر تلاش کیا جائے، اسلام کی مصلحتِ اجتماعی کو ہر مصلحت پر ترجیح دی جائے۔

مختصراً یہ کہ وہ حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ (متوفی ۱۱۷۶ھ) کے علمی وفکری اور کلامی وفقہی مدرسۂ فکر سے زیادہ قریب اور ہم آہنگ ہے، اس لحاظ سے ندوۃ العلماء ایک محدود تعلیمی مرکز سے زیادہ ایک جامع اور کثیر المقاصد دبستان فکر اور مکتب خیال ہے“۔

حضرات! اس وقت عالم اسلام جن حالات سے دوچار ہے، آپ حضرات سے مخفی نہیں ہے، اور پھر یہ ملک جس طرح سے خودکشی کے راستے پر پڑھ گیا ہے، وہ ملک کے رہنے والوں کے لیے انتہائی تشویش ناک بات ہے، خودغرضی کی ایک آگ لگی ہوئی ہے، اور جن کو سب سے زیادہ اس سلسلہ میں فکر کرنے کی ضرورت تھی وہ بات سننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

ہر دور کے چیلنجز الگ الگ ہوتے ہیں؛ لیکن اس وقت اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں جو غلط فہمیاں پیدا کی جارہی ہیں، وہ ہمارے سامنے سب

سے بڑا چیلنج ہے، یہ کام عالمی سطح پر بھی ہو رہا ہے اور اس ملک میں بھی بڑی طاقت کے ساتھ یہ کام جاری ہے، ایک دور تھا کہ ”فکری یلغار“ کے بنیادی طور پر تین مصادر بیان کیے جاتے تھے، ایک یہودیت، دوسرے نصرانیت اور تیسرے اشتراکت، یا الحاد و لادینیت، لیکن اس وقت ایک بڑا مصدر ”شدت پسند ہندوتو“ کا سامنے آیا ہے، ہندوستان میں خاص طور پر اس کے مراکز قائم ہیں اور میڈیا کا اس کے لیے بھرپور استعمال کیا جا رہا ہے۔

اس کے مقابلہ کا ایک طریقہ دفاعی ہے کہ اس کے جوابات دیے جائیں اور بہتر سے بہتر افراد اس کے لیے تیار کیے جائیں، دوسرا طریقہ اقدامی ہے، حملہ کرنے والے جن کے دامن داغ دار ہیں اور سر سے پا تک وہ انتہائی ناہمواریوں کا شکار ہیں، ان کی اصل شکل ان کو دکھائی جائے تا کہ حقیقت دنیا کے سامنے آسکے، لیکن اس کا تیسرا طریقہ جو بڑا مؤثر بھی ہے اور قدرے آسان بھی اور اس کے متعدد فوائد ہیں، یہ ہے کہ خود اپنی زندگی سے اسلام کی صحیح تصویر پیش کی جائے، اس کے لیے سب سے مؤثر اور بہتر راستہ یہ ہے کہ سیرت طیبہ کو سامنے رکھا جائے اور اپنے کردار سے سب سے بڑھ کر اس کا نمونہ عالم انسانیت کے سامنے پیش کیا جائے۔

پیام انسانیت حققت میں اسی راستے کو اختیار کرنے کی ایک دعوت ہے، اپنے اخلاق سے اور خدمت سے دلوں کو جیتنا ع

جو دلوں کو فتح کرلے وہی فاتحِ زمانہ

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے آزادی کے بعد سے ہی یہ کام شروع فرما دیا تھا اور ۱۹۷۴ء میں الہ آباد شہر میں باقاعدہ اس کا بڑا اجلاس ہوا اور ایک تحریک کی شکل میں کام کا آغاز ہوا۔ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے لیے پورے ملک میں سفر کیے، بڑے بڑے اجلاس ہوئے، ڈائیلاگ کیے گئے اور حضرت کی تقریروں کی شکل میں جو لٹریچر تیار ہوا، وہ تقسیم کیا گیا۔

آپ حضرات کو یہ سن کر مسرت ہوگی کہ اس وقت الحمد للہ ملک بھر میں دوسو سے زیادہ مقامات پر تحریک کے کارکن سرگرم عمل ہیں، مختلف اہم رفاہی کاموں کے علاوہ ذہن سازی کا عمل بھی ہے، ادھر دو سالوں میں بیسیوں ڈائیلاگ بھی کیے گئے جن کے خاطر خواہ نتائج الحمد للہ سامنے آرہے ہیں۔

حضرات! اس وقت ایک بہت اہم مسئلہ مسلمانوں کے ایمان کی حفاظت کا ہے، خاص طور پر نئی نسل جس تیزی سے غلط رخ کی طرف جا رہی ہے، ہم سب کے لیے کسی سوہان روح سے کم نہیں۔

ندوۃ العلماء صرف دار العلوم ہی نہیں، بلکہ وہ ایک تحریک ہے، ایک فکر ہے، ایک دعوت ہے، اسی لیے شروع سے اس کے بانیوں نے اس کے مختلف شعبے قائم کے جن کے ذریعے سے مختلف امور انجام پاتے رہے، ان ہی شعبوں میں ایک اہم شعبہ دعوت وارشاد بھی ہے، اس کے ذریعے سے الحمد للہ مختلف امور انجام پاتے رہے اور ایسا مفید لٹریچر تیار کیا جاتا رہا اور اس کی اشاعت کا نظام جاری رہا جو عوام وخواص کے لیے ضروری اور مفید ہے، الحمد للہ ادھر چند سالوں سے عملی طور پر بھی لوگوں کے اندر بیداری اور امت کے لیے دردمندی پیدا کرنے کے لے، متعدد عملی کام شروع کیے گئے اور شہر لکھنو سے کام کا آغاز ہوا، دار العلوم کے اساتذہ اور ملحقہ مدارس و مکاتب کے ذمہ داروں کے ذریعے یہ کوششیں شروع کی گئیں، مسجدوں کو اس تحریک دعوت وارشاد کا مرکز بنا کر الحمد للہ کوشش کی گئی کہ ہر طبقے تک بات پہنچائی جائے، چھوٹے بچوں اور بچیوں کے لیے مکاتب کا نظام، بڑوں کے لیے درس قرآن اور خطابات جمعہ، خواتین کے لیے ہفتہ واری نظام تربیت وتعلیم، پھر ضرورت مندوں کے لیے بیت المال کا قیام، الحمد للہ تقریبا ایک ہزار مسجدوں تک کام کو پہنچانے کی کوشش کی گئی، اس کے بہتر نتائج بھی الحمد للہ سامنے ہیں۔ (باقی اگلے شمارہ میں)

☆☆☆

تیری نگاہِ ناز کی تاثیر چاہیے

نتیجہ فکر:- محمد سمعان خلیفہ ندوی

عجز و نیازِ عشق کی تصویر چاہیے
تیری نگاہِ ناز کی تاثیر چاہیے

زینت عروس دہر کے ماتھے کی بن سکے
کردار کی وہ خوب سی تحریر چاہیے

دل کا غبار دھل کے نکھر آئے آئینہ
آبِ وفا سے عشق کو تطہیر چاہیے

اے جذب وشوق مجھ کو ٹھہرنے نہ دے کبھی
بامِ فلک پہ نور کی تعمیر چاہیے

کھل جائے دم قدم سے ہر اک عقدۂ حیات
جہد و عمل کی قوتِ تسخیر چاہیے

شامِ الم کے کرب سے دل بجھ گیا تو کیا
صبحِ امید کی مجھے تنویر چاہیے

ہو جس کے فیض سے دلِ بینا عطا مجھے
اسرارِ معرفت کی وہ تفسیر چاہیے

جو خواب میری آنکھوں میں اب تک سجے رہے
سمعانؔ ان کی اب مجھے تعبیر چاہیے

ندوۃ العلماء
پوسٹ باکس ۹۳، ٹیگور مارگ لکھنؤ
۲۲۶۰۰۷ یوپی (ہند)

NADWATUL-ULAMA
PO. BOX 93, TAGORE MARG, LUCKNOW
226007 U. P. (INDIA)

باسمہٖ تعالیٰ

تاریخ ۲۵/اپریل ۲۰۲۶ء

Date 25th April 2026

اہلِ خیر حضرات سے

اللہ تعالیٰ کا شکر و احسان ہے کہ حضرت ناظم صاحب ندوۃ العلماء مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی دامت برکاتہم کی سرپرستی میں ندوۃ العلماء اپنی علمی، دینی، تعلیمی و تربیتی خدمات انجام دے رہا ہے، اور ان بیش قیمت اصولوں کو سینے سے لگائے ہوئے ہے جن کے لیے ندوۃ العلماء کو قائم کیا گیا تھا، یعنی جدید زمانہ میں اسلام کی مؤثر اور صحیح ترجمانی، دین و دنیا کی جامعیت اور علم و روحانیت کے اجتماع کی کوشش، فتنۂ لادینیت اور ذہنی ارتداد کا مقابلہ، اسلام پر اعتماد اور اسلامی علوم کی برتری و امتیاز کا اعلان و اظہار، دین حق سے وفاداری اور شریعت پر استقامت۔

آپ سے ہماری درخواست ہے کہ وقت کی اس ضرورت اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کی افادیت کو سمجھتے ہوئے پوری فراخدلی، فیاضی اور ہمت سے کام لے کر ان تمام کاموں میں بھرپور تعاون و اعانت فرمائیں کہ ہندوستان میں دین کے قلعوں کی حفاظت کی اس سے بہتر کوئی سبیل اور اس سے زیادہ پائدار کوئی صدقہ جاریہ نہیں۔

لہٰذا آپ حضرات سے گزارش ہے کہ اپنے صدقات و عطیات چیک یا ڈرافٹ کے ذریعہ اور آن لائن ندوۃ العلماء کے مندرجہ ذیل اکاؤنٹ میں منتقل فرمائیں، ایسے نازک اور مشکل حالات میں ندوۃ العلماء کے ساتھ آپ کا تعاون نہایت اہمیت رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کی کاوشوں کو قبول فرمائے اور ان کو ہمارے لیے ذخیرۂ آخرت بنائے، آمین۔

(مولانا ڈاکٹر) تقی الدین ندوی	(ڈاکٹر) محمد اسلم صدیقی	(مولانا ڈاکٹر) سعید الرحمٰن اعظمی ندوی	(مولانا) محمد عمار حسنی ندوی
معتمد تعلیم ندوۃ العلماء	معتمد مال ندوۃ العلماء	مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء	ناظر عام ندوۃ العلماء

NADWATUL ULAMA

عطیات	A/c No. 1086 3759 711
تعمیرات	A/c No. 1086 3759 733
زکوٰۃ	A/c No. 1086 3759 766

IFSC CODE : SBIN0000125 - STATE BANK OF INDIA, MAIN BRANCH, LUCKNOW

ONLINE DONATION LINK
https://www.nadwa.in/donation/

نوٹ: چیک/ڈرافٹ پر صرف یہ لکھیں:

NADWATUL ULAMA

اور اس پتہ پر ارسال کریں:

Nizamat office, Nadwatul Ulama,
Tagore Marge, Lucknow - 226007 (U.P.)

معطیان کرام! براہ کرم اپنے عطیات ارسال کرنے کے بعد مندرجہ ذیل نمبر

+91-8736833376

پر مطلع فرمانے کی زحمت کریں، اس سے دفتری کاروائی میں سہولت ہوگی۔

فجزاکم اللہ خیر الجزاء

نوٹ: ندوۃ العلماء لکھنؤ کو دیا گیا تعاون سیکشن 80G انکم ٹیکس ایکٹ ۱۹۶۱ء کے تحت انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہوگا

website : www.nadwa.in
Email : nizamat@nadwa.in